غبار
(ناول)
عطیہ سیّد

پیشِ خدمت ہے "کتب خانہ" گروپ کی طرف سے ایک اور کتاب

پیشِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔ گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share
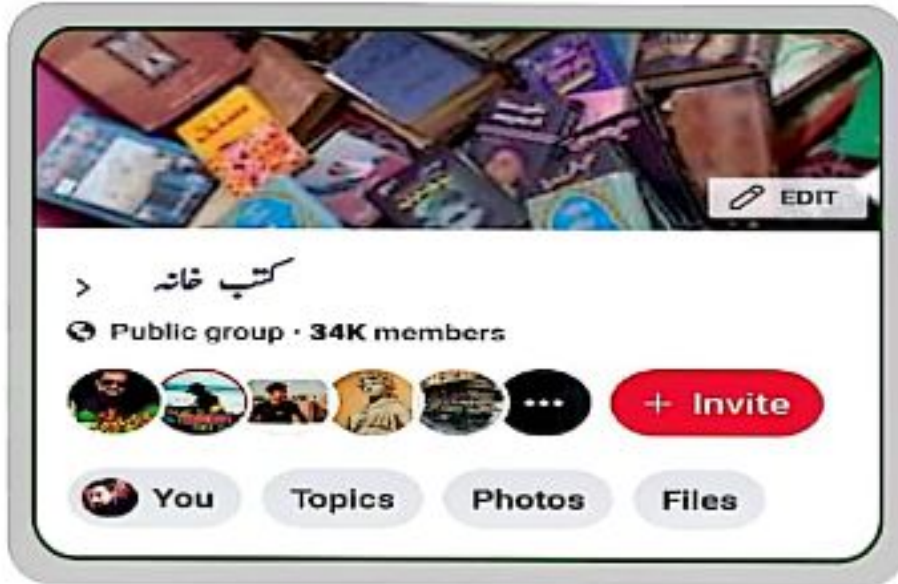
عقابی : +923055198538

محمد اطہر اقبال : +923340004895

محمد قاسم : +971543824582

میاں شاہد عمران : +923478784098

میر ظہیر عباس روستمانی : +923072128068

غبار

ناول

عطیہ سید

891.4393 Atia Sayed
Ghubaar / Atia Sayed.- Lahore :
Sang-e-Meel Publications, 2012.
144pp.
1. Urdu Literature - Novel.
I. Title.

2012

نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN-10: 969-35-2578-7
ISBN-13: 978-969-35-2578-6

Sang-e-Meel Publications

25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall) Lahore 54000 PAKISTAN
Phones 92-423-722-0100 / 92-423-722-8143 Fax 92-423-724-5101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com

کہکشاں کی شکست وریخت میں

وقت کے غبار میں

سمتیں ہیں بے نشاں

پاؤں تلے زمیں، نہ سر پہ آسماں

فاصلے ہیں لامکاں

دوریاں ہیں لازماں

نظر ہے دھند دھند، جذبے دھواں دھواں

ا
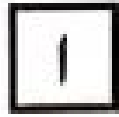
اس وقت علی کا جسم سُن تھا، لیکن اس کے ذہن میں وہ دن روشن تھا، جب وہ اکیڈمی کی Dormitory میں اپنے بستر پر لیٹا تھا۔ کھڑکی میں سے میس (Mess) کی پُرشکوہ عمارت دکھائی دے رہی تھی۔ یہ عمارت طیارے کی صورت بنائی گئی تھی۔ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا، جیسے کوئی طیارہ اپنے عظیم الشان پر پھیلائے کھڑا ہو۔ میس اور Dormitory کے درمیان سرسبز قطعے پست قد درختوں سے آراستہ تھے۔ دھوپ میں ہلکی سی حدت آنے لگی تھی کہ موسم بہار یہاں انتہائی مختصر ہوتا ہے اور اب وہ آخری دموں پر تھا۔

علی تکیہ دوہرا کر کے سر کے نیچے رکھے بستر پر سیدھا لیٹا تھا۔ اس کی نگاہیں کھڑکی سے باہر کسی غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں۔ ذہن میں اداسی کا سیاہ پردہ لہرا رہا تھا۔ اُسے یہاں بستر پر لیٹے کھڑکی کے پاس رکھے رائٹنگ ٹیبل پر پڑے نیلے کاغذ صاف دکھائی دے رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے اس کا خیال پلٹ کر ان نیلے کاغذوں کی طرف جاتا تو اس کی آنکھیں نم آلود ہو جاتیں۔ کل سے ان نیلے کاغذوں پر حفصہ کی تحریر نے اسے غمناک کر

رکھا تھا۔ اس کا رشتہ خارج سے ٹوٹ سا گیا تھا۔ وہ اپنے اندر گم تھا اور اس کے اندر سرد خ لاوے کا سیل رواں تھا کہ کھول رہا تھا۔ جس کی اٹھتی ہوئی لہریں جمی ہوئی برف کی آگ تھیں، لیکن اس کے ذہن کا ایک گوشہ اب بھی عقلی ضبط کے تحت واضح اور منور تھا۔ یہ دھوپ چھاؤں کی سی کیفیت اس کے اندر کا تضاد تھا اور اس تضاد سے وہ بچپن سے آشنا تھا جیسے بچپنے کا کوئی ہجولی جس سے اب تک اُس میں بچھڑنے کی سکت نہیں تھی۔

علی پانی کی ٹینکی کے پاس سکواڈرن لیڈر محمود کے آفس کے سامنے چلچلاتی دھوپ میں تین گھنٹوں سے اٹینشن تھا۔ اس کی پھول کی پنکھڑی جیسی جلد پہلے ہلکی گلابی، پھر سرخ اور اب بھنے ہوئے گوشت کی مانند تھی۔ اس کا جسم اکڑ چکا تھا اور چکر سے آنے لگے تھے، لیکن پٹھوں کی اینٹھن، جسمانی اذیت اور سزایافتگی کی رسوائی کے باوجود اس کا ذہن ایک ہی سوچ کے بھنور میں ڈوبتا جا رہا تھا۔ جسمانی اذیت کے ہر پل کرب کی جو لہر اٹھ رہی تھی، اس کا مدوجزر حفصہ تھی۔ کتنا ثقیل، زنیل اور غیر رومانی نام ___ لیکن اس کے لیے تو پچھلے چار سال سے ___ جب سے اُسے شعور آیا تھا ___ جب سے بیداری کی پو پھٹی تھی ___ یہ نام کس قدر پیارا اور عزیز ہو چکا تھا۔

علی وہاں کڑی دھوپ میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ آخر وہ حفصہ کو کیوں چاہتا تھا۔ کیا اس لیے کہ Mid Summer Nights' Dreams کے کردار کی طرح کسی طلسماتی محلول کے زیر اثر اس کی نظر جس لڑکی پر سب سے پہلے پڑی وہ حفصہ تھی یا عنفوان شباب کی بیداری کے بعد اس کے اردگرد صرف حفصہ ہی موجود تھی یا اس لیے کہ وہ نرگسیت کا شکار تھا اور حفصہ کی شکل میں اپنی چاہت میں مبتلا تھا کہ حفصہ اس کی عم زاد ہونے کے ناطے اُس سے چہرے مہرے اور رنگت میں مشابہہ تھی۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس نے عم زاد سے عشق کی تہذیبی روایت کی پیروی کی ہو۔ کوئی بھی سبب ہو، مگر یہ طے تھا کہ گذشتہ تین چار برس سے حفصہ اس کے لہو میں رچ بس گئی تھی اور حفصہ بھی تو اُسے اتنی ہی شدت سے چاہتی تھی۔ کم از

کم علی کا تاثر یہی تھا۔ دراصل اسے جب حفصہ کے وجود کی کشش کا احساس ہوا تو وہ اس جذبے کی گیرائی و گہرائی سے شناسا نہ تھا۔ اس کے لیے یہ بڑی بات تھی اور محبت کا شدید اظہار کہ اس نے چھ مہینے پہلے جو چھوٹا قلم حفصہ کو دیا تھا، اس نے اسے نہایت احتیاط سے سنبھال کے اپنی سنگھار میز پر ایک سنہری ڈبیا میں بطور بیش قیمت چیز کے رکھا ہوا تھا۔

لیکن اب___اب___جب کہ حفصہ دور___بہت دور جانے والی تھی___ کسی اور کی کائنات کا حصہ بن کر تو علی کو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے اسے بیہوش کیے بغیر اس پر عمل جراحی کا کوئی تجربہ کیا جا رہا ہو___ اس کے زندہ جسم سے کوئی عضو بڑی بے دردی سے جدا کیا جا رہا ہو___ اور اس کے سینے میں شیشے کی کرچی سی چبھنے لگی، جو سکواڈرن لیڈر محمود کی دی ہوئی سزا کی جسمانی اذیت پر بھاری تھی۔

کیڈٹ عدیل نے سکواڈرن لیڈر محمود کے حکم کے مطابق ٹھنڈے پانی کی بالٹی علی پر انڈیل دی۔ اس وقت کیڈٹ بابر پاس سے گذر رہا تھا۔

"Sadist"

کیڈٹ بابر نے پہلے علی اور پھر سکواڈرن لیڈر محمود (جو اپنے آفس کی کھڑکی سے دکھائی دے رہا تھا) کی طرف دیکھ کر ہلکی سی سرگوشی میں سکواڈرن لیڈر محمود کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کیا، جو یقیناً فوجی نظم و ضبط کے خلاف تھا۔

بابر کو علی خاکی کیڈٹ وردی پہنے سر پر سائیڈ کیپ سجائے، وہاں چلچلاتی دھوپ میں کھڑا بے حد حسین دکھائی دے رہا تھا۔ ویسے تو علی کے نفیس نقوش اور دبلا پتلا جسم اس کے لیے ہمیشہ سے پُرکشش تھا۔ لیکن آج سنہری دھوپ میں دو تین گھنٹے کھڑے رہنے سے علی کی بے بس اور کرب سے مخمور آنکھوں نے اس کے دل کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔

جب کیڈٹ عدیل نے ٹھنڈے پانی کی بالٹی علی کے جسم پر انڈیلی تو اس کا نازک لڑکیوں جیسا وجود کپکپا اٹھا۔ علی کو وہاں پانی کی ٹینکی کے پاس کھڑے، سُن ہونے کے

باوجود آفس کی کھڑکی سے سکواڈرن لیڈر محمود صاف نظر آرہا تھا۔ سکواڈرن لیڈر محمود کے ہونٹوں کے کناروں پر ایک محظوظ مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں شریر طمانیت تھی۔ جیسے کوئی رومن امیر کسی گلیڈی ایٹر اور چیتے کی کشمکش سے لطف اندوز ہو رہا ہو___ اور یہ سب کچھ جو علی بھگت رہا تھا، ایک ہلکی سی لغزش کی بناء پر تھا، جس سے فوجی نظم و ضبط کی متشدد میکانکس متحرک ہو چکی تھی۔

اب سورج نصف النہار سے کافی آگے سفر کر چکا تھا۔ علی کا سر یوں دُکھ رہا تھا جیسے کوئی بہت بڑا پھوڑا جس سے پیپ رسنے والی ہو۔ وقت کے پھسلتے لمحوں کے ساتھ اس کے جسم کی اکڑ اور سر کی دکھن دھندلا نے سی لگی___ اور اس نے دیکھا کہ وہ ایک لق و دق صحرا میں چل رہا ہے___ سورج کی حدت سے بے حال، اس کی آنکھیں چندھیا گئی ہیں۔ اس کی نازک جلد جگہ جگہ سے پھٹ چکی ہے، ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہیں، خاکی وردی تار تار ہو چکی ہے، پاؤں میں سروس بوٹ گل سڑ کر پھٹ گئے ہیں___ لیکن وہ چلا جا رہا ہے___ اکیلا___ صحرا میں، اور کوئی ذی روح موجود نہیں___ بس وہ ہے اور ریت کا سمندر۔ اس کے پیچھے خود اس کے اپنے قدموں کے نشان ہیں___ اور آگے___ کچھ بھی نہیں سوائے ریگِ رواں کے۔ اس کے قدم بوجھل ہیں اور پاؤں ریت میں دھنستے چلے جا رہے ہیں۔ آخر ریگِ رواں نے اسے ڈھانپ لیا___ اس کا دم گھٹنے لگا___ اور پھر تاریکی___ مہربان اندھیرا۔

جب تاریکی چھٹنے لگی، اندھیرا گھٹنے لگا تو ایک دھندلکا سا علی کے اردگرد پھیل گیا۔ اس دھندلکے کے ملگجے پن میں ایک مہربان مگر متفکر چہرے کے نقوش ابھرے۔ تھوڑی دیر بعد یا پھر کافی دیر بعد (کہ وہ وقت کا تعین کرنے سے قاصر تھا) جب روشنی نمودار ہوئی جس کی چبھن سے اس کی آنکھیں کھل گئیں اور اس کے کھولتے وجود میں سکون کی نرماہٹ اترنے لگی، تو اس نے پہچانا کہ یہ مہربان چہرہ بابر کا تھا۔

علی نے بستر سے اٹھنے کی کوشش کی تو بابر نے اُسے لیٹے رہنے کا اشارہ کیا۔

"کیا ہوا تھا؟" علی نے بابر سے دریافت کیا۔

"تم بے ہوش ہو گئے تھے۔"

پھر بابر کے چہرے پر غصے کا ہلکا سا تاثر ابھرا اور وہ زیر لب بڑبڑایا۔

"Sadist___Bastard!"

علی جانتا تھا کہ تحت فوجی ضوابط کے تحت کسی افسر کے بارے میں اس قسم کی رائے کا اظہار بابر کے لیے کتنا خطرناک ثابت ہو سکتا ہے۔ اس نے فوراً اپنا ہاتھ بابر کے ہونٹوں پر رکھ دیا تاکہ وہ مزید غیر ذمہ دارانہ الفاظ نہ کہہ سکے۔

جب علی کا نازک پتلا ہاتھ بابر کے لبوں سے ٹکرایا تو بابر کو یوں محسوس ہوا جیسے پھول کی پنکھڑی کا لمس۔ بعد میں جب بابر علی کے لیے کینٹین سے فراسٹ جوس لینے گیا تو سارا راستہ اس کے ہونٹوں پر یہ ہوا کی طرح نازک سا لمس تازہ رہا۔

اس دن کے بعد علی اور بابر نامحسوس طور پر ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ وہ فراغت کا وقت ایک دوسرے کے ساتھ گذارتے۔ بیڈمنٹن کھیلتے تو اکٹھے، واک کرتے تو اکٹھے، ٹی۔ وی روم میں فلمیں دیکھتے تو ایک دوسرے کے ساتھ، کھانا کھاتے تو ایک دوسرے کے قریب بیٹھ کر۔ آہستہ آہستہ دوسرے لڑکوں نے اس بات پر غور کرنا شروع کر دیا کہ علی اور بابر دونوں ہر وقت ساتھ ساتھ ہوتے ہیں۔ بعض لڑکوں نے مذاق بھی اڑانا شروع کر دیا۔ علی کی رنگت دودھیا تھی اور بابر کی سیاہی مائل۔ اس نسبت سے کئی شرارتی لڑکوں نے انہیں رضیہ سلطان اور یاقوت حبشی کی جوڑی قرار دے دیا۔ بعض ایسے بھی تھے جو بابر کو اس کا Negative کہتے تھے۔ اگر کبھی کبھار بھولے سے علی اکیلا ہوتو فوراً اس سے سوال کرتے۔

"بھئی! وہ تمہارا Negative کہاں ہے؟"

علی جواب میں مسکرا دیتا اور اس کی منگول آنکھیں مسکرانے سے اور چھوٹی ہو جاتیں۔ شاید اسے اس قسم کے جملے ناگوار بھی گذرتے تھے، مگر اسے بچپن سے عادت ہو گئی تھی ہر ناگواری کو پی جانے کی۔ اب تک اس نے زندگی کے زہر ہلاہل کو پیشانی پر شکن ڈالے بغیر ہی اپنے وجود میں سمو لینے کی کوشش کی تھی۔

یہ زہر ہلاہل اس کی جڑوں میں بہت قدیم تھا۔ جب ننھے منے بوٹ اور نیکر پہنے اسے ہوش آیا تو اس نے اپنے سے پہلے اپنے بڑے بھائی حسین کو گھر میں پایا۔ حسین بھائی ایک مثالی بیٹے تھے۔ ابو اور امی اُن کے گن گاتے تھے۔ محلے والے مدح سرا تھے اور سب سے بڑھ کر علی خود ان پر فریفتہ تھا۔ حسین بھائی علی کے لیے وہ سب کچھ تھے جو وہ خود نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ وہ عمر میں بڑے ہونے کے سبب نوجوان تھے، جب کہ علی خود محض ایک بچہ تھا۔ حسین بھائی ابو اور امی کی ہر ہدایت پر عمل کرتے تھے اور علی ___ علی ان کے قرار کا بیری تھا، حالانکہ وہ ایسا نہیں چاہتا تھا ___ مگر نجانے کیسے اور کیوں کر ایسا ہو جاتا تھا ___ اس سے کوئی نہ کوئی ایسی حرکت سرزد ہو جاتی تھی، جو اس کی امی کو بیزار کر دیتی تھی اور ابو کے قہر کو دعوت دیتی تھی۔

وہ دن اُسے یاد تھا جب اس نے امی کی لپ اسٹک اپنے ہونٹوں اور نیل پالش اپنے ناخنوں پر لگانے کے بعد سنگھار میز پر رکھے مختلف قسم کے لوشنز کو کمرے کے فرش پر بچھے قالین پر گرا کر لوشنز اور قالین دونوں کا ستیاناس کر دیا تھا۔ اس دن امی، ابو اور حسین بھائی کسی شادی میں شریک ہونے کے لیے گئے ہوئے تھے۔ علی گھر پر اکیلا تھا ___ بالکل اکیلا، اور اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ وہ کیا کرے اور کیسے وقت گذارے۔ جب اس نے امی اور ابو کے کمرے میں تخریب کاری کرنی شروع کی تو اسے یوں لگا کہ وقت گذارنے کا ایک حیلا اُس کے ہاتھ آ گیا ہے ___ وقت کٹ گیا، مگر پھر اسے شدید خوف نے دبوچ لیا۔ اسے معلوم تھا کہ امی اس تخریب کاری سے سخت برہم ہوں گی۔

علی ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اسے باہر کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ وہ دھڑکتے دل اور ڈولتے قدموں کے ساتھ گودام میں بستروں والی پیٹی کے پیچھے دبک گیا اور وہیں چھپا رہا___ رات بھر___ لرزتا ہوا___ خوفزدہ۔ صبح گھر والوں نے اسے بالآخر ڈھونڈ نکالا۔ اسے اس دن کی ذلت آج بھی یاد تھی۔ اس ذلت نے اس کے سینے کو گرم سلاخ سے داغ دیا تھا___ اور اس داغ کی بدصورتی آج بھی اس کے ذہن سے چمٹی ہوئی تھی۔

لیکن اسی بدصورت رات کے ساتھ ایک خوبصورت یاد یوں لپٹی ہوئی تھی جیسے کسی کائی زدہ دیوار کے ساتھ عشق پیچاں کی بیل، جو کائی زدہ دیوار کی بدہیئتی کو اپنے نازک دلفریب وجود سے دیدہ زیب بنادیتی ہے۔ اس قہر کی رات کو جب علی کا سارا جسم لرزہ بر اندام تھا اور وہ بستروں والی پیٹی کے عقب میں دیوار سے چھپکلی کی طرح چپکا ہوا تھا، بالآخر ابو نے اسے ڈھونڈ لیا۔ اور گھسیٹ کر باہر نکالا تو یہ حسین بھائی ہی تھے، جو اسے ابو کے غیض و غضب سے بچانے کے لیے اپنے کمرے میں لے گئے تھے___ یہ حسین بھائی ہی تھے، جنہوں نے اس کے جلتے ہوئے ماتھے پر بوسہ دیا تھا اور اس کے بید مجنوں کی طرح کانپتے ہوئے جسم کو اپنے ساتھ چمٹا کر بستر پر لٹا لیا تھا۔ اس وقت اسے ایک ناقابل بیان سکون کا احساس ہوا تھا___ وہ آہستہ آہستہ سو گیا تھا___ میٹھی نیند۔ حسین بھائی کے لمس میں عجیب سرور تھا۔

وقت گذرتا گیا۔ اب بھی کبھی کبھی غصہ علی کے لہو میں در آتی اور اس کی یاد باطن میں ہلکی سی سرگوشی کی مانند ابھر آتی۔ مگر یہ کیفیت صرف وقتی ابال کی سی ہوتی، پھر وہ بحال ہو جاتا۔ اس کی توجہ بٹانے میں بابر کا بڑا ہاتھ تھا۔ بابر اسے فرصت کے لمحات میں ہر طور مصروف رکھتا، تحفے تحائف پیش کرتا اور تعریفی جملوں کی بوچھاڑ بھی کرتا۔ بابر کی آنکھوں میں فریفتگی دیکھ کر اور بابر کے منہ سے اپنی تعریف سن کر علی کی زخم خوردہ انا کو بڑی تسکین ملتی۔ رہے تحفے

تحائف تو علی ایک بچے کی طرح ان سے پل بھر کے لیے خوشی حاصل کرتا اور اس کے بعد انہیں کہیں پھینک کر بھول جاتا یا کسی اور کے حوالے کر دیتا۔

ان دنوں میں بابر نے اپنے کیمرے سے علی کی بے شمار تصاویر بنا ڈالیں۔ لیکن جب بابر اسے وہ تصویریں دکھاتا تو وہ گھڑی بھر کے لیے انہیں دیکھتا اور پھر ہنس کے بابر کو واپس لوٹا دیتا، جیسے وہ اس کی نہ ہوں، پرائی ہوں۔ ایک دن بابر نے کسی لڑکے سے کہا کہ وہ اس کی اور علی کی اکٹھی تصویر بنائے۔ جانے کیوں بابر نے تصویر کھینچنے کے لیے اس مقام کا انتخاب کیا جہاں علی کی ذلت کی یاد صلیب کی مانند گڑی تھی۔ یعنی پانی کی ٹینکی کے پاس سکواڈرن لیڈر محمود کے آفس کے سامنے۔

بابر علی سے بغلگیر ہوا اور دونوں نے مسکراتے ہوئے تصویر بنوالی۔ بابر نے یہ تصویر اصرار کر کے زبردستی علی کو دی کہ وہ کم از کم ایک تصویر تو اپنے پاس رکھے۔ علی نے بابر کا دل نہ توڑنے کے خیال سے بادلِ نخواستہ تصویر لے لی۔ اس نے اپنے کمرے میں کپڑوں والی الماری کے ایک خانے میں کپڑوں کے نیچے بچھی ہوئی اخبار کی تہہ میں اسے رکھ دیا اور بھلا دیا، جیسے وہ عموماً چیزوں، یادوں، جذبوں، محرومیوں، حتیٰ کہ دوسروں کی اس سے کی گئی محبتوں کو طاقِ نسیاں میں رکھ کر یوں فراموش کر دیتا تھا جیسے کوئی فالتو سامان کو گودام میں بند کر کے باقی گھر کو صاف ستھرا کر لیتا ہو۔

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ علی کو بابر سے لگاؤ نہیں تھا۔ کبھی کبھی کوئی لڑکا علی سے سنجیدگی سے پوچھتا کہ آخر وہ ہر وقت بابر کو ساتھ کیوں لیے پھرتا ہے، اسے اس میں کیا نظر آیا، تو علی ہنستے ہوئے خاموش رہتا، کیونکہ بنیادی طور پر وہ ایک سہما ہوا شخص تھا۔ لیکن دل ہی دل میں اس سوال کے جواب میں کہتا۔ "محبت ___ وہ محبت جو بابر کو اس سے ہے۔" اور یہ سچ تھا کہ ان کی مسلسل قربت کا سبب یہی تھا۔ اتنی گرم جوشی اور اس کا برملا اظہار، اس نے اس سے پہلے اپنے لیے کسی میں نہ دیکھا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ حفصہ کو بھی اس سے

لگاؤ تھا، مگر اس کا کھلا اظہار اس طرح سے کبھی نہ ہوا تھا، شاید لڑکی ہونے کے ناطے روایتی حجاب کے باعث۔

دن ہفتوں میں، ہفتے مہینوں میں اور مہینے سالوں میں ڈھلتے چلے گئے۔ بابر علی سے سینئر تھا، سو اس نے علی سے پہلے فلائنگ کورس مکمل کر لیا اور اس کی پاسنگ آؤٹ کا وقت آن پہنچا۔

صبح پاسنگ آؤٹ تھی۔ علی رات کے کھانے کے بعد میس میں اکیلا بیٹھا تھا۔ وہ پہلی مرتبہ بابر کی رفاقت سے محروم ہوا تھا، ورنہ بابر تو سائے کی طرح اس کے ساتھ رہتا تھا۔ آج بابر اپنے والدین کے پاس تھا، جو اس کی پاسنگ آؤٹ میں شریک ہونے کے لیے آئے ہوئے تھے اور اکیڈمی کے اس ونگ میں ٹھہرے ہوئے تھے، جو مہمانوں کے لیے وقف تھا۔ بابر کی محنتِ شبینہ، عرق ریزی اور مغز ماری آخر رنگ لائی تھی اور وہ آخری آزمائش سے بھی گذر کر پائلٹ بن چکا تھا۔ اب وہ فضاؤں پر حاوی تھا اور زمین پر بھی سرخرو تھا۔ کامرانی کے احساس سے لبریز اس پل، علی کا وجود ذرا دھندلا سا گیا تھا۔ بابر اس کامیاب لمحے کے انبساط میں صرف اپنے والدین کو شریک کر سکتا تھا۔ علی اس کی مسرت کو محسوس کرنے کے اظہار کے باوجود اسے محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ سچ تو یہ تھا کہ وہ بابر کے لیے زندگی کے اس دمکتے موڑ پر اچانک بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ اس موڑ کے کاٹتے ہی بابر کے سامنے نئے منظر بادبان کی طرح کھل گئے تھے۔ نئی زندگی کی نوید ہوا کی طرح اس کے ماتھے پر بوسے دے رہی تھی۔ بہت سی نئی توقعات، تازہ امیدیں اور مستقبل کے خواب، ایک ہجوم کی شکل میں اس کے دروازے پر دستک دے رہے تھے___ اور علی___ علی ابھی تاریک کمرے میں تھا، جس کی کھڑکی سے باہر کا منظر سانولا سا تھا۔ اسے شاہین بننے کے لیے ابھی کئی آزمائشوں سے گذرنا تھا، جن کے نتائج نامعلوم تھے۔ لیکن ان سب اندیشوں اور

وسوسوں سے بڑھ کر جو سوچ بلیڈ کی طرح اس کے دل کو کاٹ رہی تھی، وہ بابر کی جدائی کا تصور تھا۔کل بابر چلا جائے گا____ ایک لحاظ سے ہمیشہ کے لیے۔جانے اس کی پوسٹنگ کہاں ہو۔شاید وہ برسوں تک ایک دوسرے سے نہ مل سکیں گے۔

اور اداسی نے اس کے اندر کروٹ سی لی۔

"لیکن بابر کے لیے یہ علیحدگی کس قدر آسان تھی۔" علی نے تلخی سے سوچا۔

بابر دو گھنٹے پہلے علی کے پاس آیا تھا اور اس کے ہاتھ میں وقتِ رخصت اپنی یگانگت کے ثبوت کے طور پر گفٹ پیپر میں لپٹا ایک چھوٹا سا ڈبہ تھما کر چلا گیا تھا____ اپنے والدین کے کمرے میں۔

علی نے کافی شاپ میں پہنچ کر کافی کا آرڈر دیا اور کھڑکی کے پاس بچھی ایک میز پر بیٹھ گیا۔اس کے ہاتھ میں بابر کا دیا ہوا الوداعی تحفہ تھا، جو اس نے میز پر رکھ دیا۔سرخ اور کالے تجریدی ڈیزائن سے مرصع گفٹ پیپر علی کی آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔وہ ابھی کچھ دیر تک اسے کھولنا نہیں چاہتا تھا____ سسپنس (Suspense) کو برقرار رکھنا چاہتا تھا۔

کافی آ گئی____ سیاہ اور تلخ علی کی سوچوں کی مانند۔علی نے کافی کی ایک چسکی لی اور سوچا____ آخر وہ اتنا مایوس اور دل برداشتہ کیوں ہے؟ ابھی تک اس نے بابر کو کوئی خاص اہمیت نہ دی تھی۔وہ فرض کر چکا تھا کہ بابر اس کا مفتوح اور تابع ہے۔آج اچانک اس مفتوح میں آزادی اور خودمختاری کے آثار پیدا ہو گئے تھے____ اور علی یکدم تنہا رہ گیا تھا۔

کافی ختم ہو گئی۔علی نے سوچا کہ اب وہ گفٹ پیپر میں لپٹے تحفے کو کھول کر دیکھ لے۔گفٹ پیپر کے اندر ایک چھوٹا سا ڈبہ تھا جس میں ایک خوبصورت نقرئی سگریٹ لائیٹر تھا اور اس کے نیچے رکھے کارڈ پر لکھا تھا۔

"اس کے لیے جو مجھے بے حد عزیز ہے____ لائیٹر جو اُسے

ہمیشہ____ ہر سگریٹ کے ساتھ میری یاد دلاتا رہے گا۔

علی ___ میں تمہیں کبھی نہیں بھلاؤں گا۔"

محبت کے ساتھ

بابر کی جانب سے

جانے کیوں ان محبت سے لبریز جملوں نے اس کے منہ پر ہلکا سا طمانچہ رسید کیا۔ کتنا آسان تھا بابر کے لیے ایک طویل اور گہرے تعلق کو اس تحفے اور ان جملوں کے ذریعے سے سمیٹنا ___ "میں تمہیں کبھی نہیں بھلاؤں گا" کتنا سرد تھا یہ جملہ، جیسے کسی عزیز کی قبر پر کتبہ لگا کر یہ سمجھنا کہ محبت کا قرض ادا ہو چکا ہے ___ اور اس کے بعد اس کی یاد کو سرد خانے میں ڈال دینا۔

ہوا کا ایک جھونکا کافی شاپ کی کھلی کھڑکی سے داخل ہوا اور علی کے جسم سے ٹکرایا۔ جانے وہ سرد تھا یا نہیں، لیکن اسے کپکپی سی محسوس ہوئی۔ کافی شاپ بند ہونے والی تھی۔ علی کافی کی دو تین پیالیاں پی چکا تھا۔ پیسے ادا کرنے کے بعد وہ نیچے اتر آیا۔ بیرے ایک ایک کر کے میس کی بتیاں گل کر رہے تھے۔ وہ میس کے صدر دروازے سے باہر نکلا۔ سامنے کھلے گھاس کے قطعے، ولایتی گلابوں کی کیاریاں اور سیمنٹ سے پختہ روشیں ___ سب اداس تھیں۔ پو پھٹنے والی تھی۔ ستارے ڈوبتے چلے جا رہے تھے۔ علی نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔ صبح کا ستارہ، دھندلا سا، چڑھتے سورج کے قدموں کی چاپ سننے کے باوجود ابھی قائم تھا ___ سانس کی طرح لرزاں۔

"لیکن تھوڑی دیر میں صبح کا ستارہ بھی ڈوب جائے گا ___ کہ سب فنا ہے ___ ساری محبتیں، نفرتیں، سب جذبے ___ سب رفاقتیں، مختصر ہوتی ہیں ___ وہ بھی جو عزیز ہیں اور وہ بھی جو عزیز تر ہیں ___ لیکن کارزارِ حیات میں تو وہی جانبر ہوتے ہیں، جو قوی اور توانا ہوتے ہیں۔ Survival of the fittest کا اصول تو ہر جا کارفرما ہے۔ سو میری جان! صبح کے ستارے کی طرح جب تک ہو سکے، قائم رہو۔"

علی نے سوچا اور جیب سے سگریٹ کی ڈبیا نکال کر ایک سگریٹ سلگایا۔ نتھنوں کو لطف سے سکیڑ کر کش لگایا اور اپنے پھیپھڑوں کی پوری توانائی سے اس نے اندر کی تلخی کو دھوئیں کے ساتھ باہر اُگل دیا۔ پھر وہ چھوٹے چھوٹے قدموں سے چلتا ہوا سگریٹ کا حظ لیتا ہوا Dormitory کی طرف چل دیا۔

۲

ایک طیارہ زن سے Dorm کی چھت پر سے گذر گیا۔ کیڈٹس کا ایک گروپ اس وقت پرواز کی شبینہ مشقوں میں مصروف تھا۔

کل سے سرما کی تعطیلات شروع ہونے والی تھیں۔ لیکن علی اکثر لڑکوں کی طرح آج رات ہی لاہور روانہ ہونا چاہتا تھا تا کہ صبح سویرے اپنے گھر پہنچ جائے اور ایک قیمتی چھٹی سفر میں ضائع ہونے سے بچ جائے۔

علی نے جلتے ہوئے سگریٹ کا آخری سرا رائٹنگ ٹیبل پر رکھی ایش ٹرے میں بجھایا اور کپڑوں والی الماری سے سفر میں ساتھ لے جانے والے کپڑوں کو بیگ میں رکھنا شروع کر دیا۔ کپڑوں کو بیگ میں ڈالنے کے بعد اس نے نیچے بچھے اخبار کو الٹ پلٹ کر دیکھا کہ کہیں اس کے اندر پیسے تو نہیں رکھے۔ اس کی عادت تھی کہ وہ کپڑوں کے نیچے بچھے اخبار کی تہوں میں روپے رکھ دیا کرتا تھا، تا کہ محفوظ رہیں۔ جب اس نے نیچے بچھی اخبار کو ٹٹولا تو اس کے ہاتھ سے کوئی چیز ٹکرائی۔ علی نے اسے باہر کھینچ لیا۔ یہ وہ تصویر تھی، جو بابر نے

اس سے بغلگیر ہو کر بنوائی تھی۔ اس کے ہونٹوں کے کناروں پر ہلکی سی طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے تصویر دوبارہ اخبار کے اندر کی تہہ میں سرکا دی۔ اسے معلوم تھا کہ لڑکوں کے جانے کے بعد کمروں اور الماریوں کی صفائی ہوگی۔ اخبار کو ردی سمجھ کر پھینک دیا جائے گا اور اس کے ساتھ وہ تصویر جو علی کے لیے بے معنی ہو چکی تھی، خود بخود ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائے گی۔ علی چاہتا تو اس تصویر کو پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں بھی پھینک سکتا تھا۔ مگر نجانے کیوں وہ ایسا نہ کرنا چاہتا تھا___ شاید گذرے وقتوں کی یگانگت آڑے آ رہی تھی۔

علی اکیڈمی سے نکل کر نوشہرہ پہنچا اور وہاں سے سیدھی لاہور جانے والی بس میں سوار ہو گیا۔ اس نے بس میں بیٹھتے ہی سگریٹ سلگا لیا۔ کچھ دنوں سے وہ چین سموکر بن چکا تھا۔ ویسے تو اس نے چودہ برس کی عمر ہی سے سگریٹ نوشی شروع کر دی تھی۔ امی ابو دونوں سگریٹ نوش تھے۔ علی ایک متجسس بچہ تھا۔ ابتدا میں اس نے امی ابو کے پیے ہوئے سگرٹوں کے بچے کھچے ٹکڑوں کو پینا شروع کیا تا کہ دریافت کر سکے کہ اس کے والدین کو اس شغل سے کیا حاصل ہوتا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ وہ خود سگریٹ نوشی کا عادی ہو گیا۔ البتہ وہ بزرگوں کے سامنے سگریٹ نوشی سے کتراتا، حالانکہ وہ جانتے تھے کہ علی یہ شوق کرتا ہے___ بس یونہی حجاب سا تھا۔

سگریٹ ختم ہو چکا تھا۔ علی نے اس کا بچا کھچا ٹکڑا بس کی کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔ رات گہری تھی۔ سڑک بے انت معلوم ہوتی تھی۔ سفر صدیوں پر حاوی تھا۔ علی جسم کو ڈھیلا چھوڑ کر بیٹھ گیا۔ اب وہ آرام سے تھا۔ مکمل طور پر خالی الذہن۔ ایسی ساعتوں میں ایک خلاء اس کے اندر اور باہر اپنی چادر تان لیتا تھا___ مگر یہ محرومی اور یاس کا خلا نہیں تھا___ بس سکون تھا اور سکوت تھا، جیسے اس کے اندر کوئی ایسا سمندر تھا، جس میں کوئی مد و جزر نہ تھا___ جو بے انت اور بیکراں تھا۔ اس کیفیت میں نہ خوشی تھی، نہ غم، نہ کوئی توقع، نہ

کوئی خواہش اور نہ کوئی تمنا۔ شاید یہ وہ ذہنی حالت تھی جسے بدھ بھکشو "سن یا تا" کے نام سے یاد کرتے ہیں اور ساری عمر کی ریاضت کے بعد بھی بہت کم ہی حاصل کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔ لیکن علی کو انجانے میں لاشعوری طور پر بچپن سے عنفوانِ شباب تک آتے آتے یہ قدرت کی طرف سے ودیعت ہوئی تھی۔

جب علی بارہ سال کا تھا، تو ابو نے اس کی شرارتوں سے تنگ آ کر اسے سرگودھا کیڈٹ سکول میں داخل کروا دیا تاکہ فوجی نظم وضبط کے زیر اثر وہ سدھر جائے۔ سرگودھا کیڈٹ سکول میں علی اکثر بیمار رہتا۔ اس کے اندر گھر سے جدائی نے سیلن زدہ اداسی کو جنم دیا۔ ویسے تو گھر میں بھی اس کی کونسی وقعت تھی، لیکن گھر کا سائبان تو اس کے سر پر تھا۔ سرگودھا کیڈٹ سکول میں تو وہ اجنبیوں کے درمیان کھلے آسمان تلے تھا۔ اسے اتنی چھوٹی سی عمر میں ایک مہابدھ درپیش تھا___ معرکہ حیات کہیں اس کے وجود کے سوتوں میں شروع ہو چکا تھا___ اور وہ تھا کہ ابھی کیل کانٹے سے لیس بھی نہ تھا۔ نہ وہ جنگجو تھا اور نہ جیالا۔ وہ نہتہ بھی تھا اور اناڑی بھی۔ پھر نجانے کس روحانی عمل سے___ پُر خار گھاٹیوں اور شوریدہ سر دریاؤں سے گذر کر اس کے باطن نے خلاء کی تکنیک کو جنم دیا۔ اب وہ جب چاہتا، دنیا کی یورشوں سے، اپنے اندر پھوٹنے والے لاوے کے بھنور سے، ثابت وسالم بچ کر نکل جاتا اور سن یا تا کے عظیم خلاء میں محفوظ ومحصور ہو جاتا۔

علی صبح سات بجے لاہور میں تھا۔ اس نے انٹرسٹی لنکرز کے اڈے سے رکشا لیا اور دس منٹ میں اپنے گھر پہنچ گیا۔

علی کا گھر شہر کی ایک مشہور تجارتی شاہراہ کی پچھلی گلیوں میں واقع تھا۔ کسی زمانے میں یہ شہر کا جدید اور فیشن ایبل علاقہ تصور کیا جاتا تھا، مگر وقت کے بہاؤ کے ساتھ اس کی ہیئت اور حیثیت بدل چکی تھی۔ اب یہاں سفید پوش متوسط طبقے کی رہائش تھی۔ یہیں ایک گھر

انگریزوں کے وقتوں کا تھا، جس کے بڑے بڑے لانز غائب ہو چکے تھے اور ان کی جگہ ایک چھوٹا سا باغیچہ رہ گیا تھا۔ اس گھر کی چھتیں بہت اونچی تھیں۔ سو مالک مکان نے اس مکان کو دو پست قد منزلوں میں تبدیل کر لیا تھا۔ علی کا خاندان کرائے دار تھا اور اوپر کی منزل میں فروکش تھا۔ اس اوپر کی منزل کا دروازہ اور سیڑھیاں براہ راست گلی میں اترتی تھیں۔ باہر والے دروازے سے داخل ہوتے ہی ایک تنگ پتلی راہداری جس کے بائیں جانب باورچی خانہ تھا۔ راہداری کے آخری سرے پر کھانے کا کمرہ تھا۔ کھانے کے کمرے کے دائیں طرف امی کا بیڈ روم تھا۔ بائیں جانب کا کمرہ بطور ڈرائینگ روم استعمال ہوتا تھا۔ ڈرائینگ روم سے ملحق ایک کمرہ تھا، جس میں حسین بھائی سوتے تھے اور اگر علی گھر پر ہو تو وہ بھی اسے ہی استعمال کرتا تھا ___ اور بس ___ یہ تھی کُل کائنات علی کے خاندان کی۔

علی گھر میں داخل ہوا تو امی نے بڑھ کر ماتھے پر بوسہ دیا۔ اس کا حال احوال پوچھا۔ اس نے حسین بھائی کے بارے میں دریافت کیا۔ امی کی آنکھوں میں اداسی سی اتر آئی۔ انہوں نے بتایا کہ حسین بھائی ساتھ والے کمرے میں نماز پڑھ رہے ہیں۔

علی غسل خانے گیا، منہ ہاتھ دھویا، اور تازہ دم ہونے کے بعد امی کے ہاتھ کی بنی چائے سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ حسین بھائی کمرے میں داخل ہوئے۔ قدرے نکلتا ہوا قد، لاغر، زرد رو۔ حسین بھائی کی رنگت میں ایسی زردی تھی جو بند کمروں میں سورج سے خوفزدہ لوگوں کے چہرے پر ہوتی ہے۔ مسلسل عبادت سے ماتھے پر نیلا نشان ابھرنے کے بعد اب سیاہی مائل ہو رہا تھا۔ چہرے پر بچوں والی معصومیت اور بے بسی تھی۔ علی سے بغلگیر ہونے کے بعد حسین بھائی بغیر کچھ کہے سنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ تھوڑی دیر میں حسین بھائی پھر نمودار ہوئے اور علی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے ایک بار پھر کچھ کہے سنے بغیر راہداری سے ہوتے ہوئے باہر نکل گئے۔ علی ان کے تلون کا عادی تھا، سو حیران ہوئے بغیر اس نے چائے پینے کے عمل کو جاری رکھا۔ چائے پینے کے بعد اس نے امی سے

اجازت لی کہ اسے زوردار نیند نے دبوچا ہوا تھا۔ اس کا بستر حسب سابق حسین بھائی کے کمرے میں بچھے قالین پر لگا دیا گیا تھا۔ امی سے اجازت لینے کے بعد وہ حسین بھائی کے کمرے میں آیا اور اپنے بستر پر ڈھیر ہو گیا۔

علی رات کے کھانے کے بعد حسین بھائی کے کمرے میں اپنے بستر پر لیٹ کر ان کا انتظار کرنے لگا۔ وہ ابھی تک واپس نہیں آئے تھے۔ وہ وہاں اپنے بستر پر لیٹے لیٹے سوچنے لگا کہ بعض بلند و بالا چبوترے پر کھڑے بت کتنی جلدی وقت کی آندھیوں سے مسمار ہو جاتے ہیں۔ جب ابوان سب کو چھوڑ کر دس سال کے لیے امریکہ چلے گئے اور وہاں کسی پاکستانی عورت سے شادی رچالی تو علی کے مقابلے میں اس بے وفائی کا زیادہ صدمہ حسین بھائی ہی کو ہوا۔ وہ کہ ابا کی آنکھ کے تارے اور امی کے دلارے تھے۔ ان کی محبتوں سے سینچا، لاڈوں سے پالا پوسا وجود کس قدر نازک تھا۔ ان کی شخصیت کی عمارت جو علی کو مضبوط محسوس ہوتی تھی، کس قدر بودی نکلا۔ ہوا کے پہلے ہی تند و تیز ریلے کے سامنے کھڑی نہ ہو سکی اور ریزہ ریزہ ہو گئی۔ اس وقت حسین بھائی بی۔ ایس۔ سی کے طالب علم تھے۔ اس تعلیمی مرحلے میں ایسے اٹکے کہ اب تک کنارے نہیں لگ سکے تھے۔ زمین ان کے پاؤں تلے سے سرک چکی تھی اور سر پہ کوئی آسمان بھی نہ تھا۔

بس حسین بھائی اللہ والے ہو گئے۔ مذہبی بن گئے۔ دن رات عبادت، قرآن خوانی اور مذہب سے متعلق کتب کا مطالعہ، ان کا معمول بن گیا۔ دنوں تک کمرے میں بند رہتے۔ لب سل گئے اور خاموش رہنے لگے۔ یار دوستوں، عزیزوں اور رشتہ داروں سے ملنا جلنا ترک کر دیا۔ معلوم نہیں اللہ میں کھو گئے تھے یا اپنے آپ میں۔ ابو کی دوسری شادی کے بعد گھر کی اقتصادی حالت بگڑ چکی تھی، لیکن حسین بھائی کو صورت حال کی سنگینی کا احساس تک نہ تھا۔ وہ علی سے عمر میں دس برس بڑے تھے۔ سو انہیں کب کا برسر روزگار ہو جانا چاہیے تھا۔

گھر کی تمام ذمہ داریاں سنبھال لینی چاہیے تھیں، مگر وہ تو روحانی طور پر کالے کوسوں کی مسافت پر ایسے نکلے کہ پھر لوٹ کر نہیں آئے۔ ہاں ان کا جسم گھر کے اندر چلتا پھرتا دکھائی دیتا تھا، لیکن روح کہیں اور منتقل ہو چکی تھی۔ یوں حسین بھائی جن سے امی کی ساری امیدیں وابستہ تھیں عین میدان کارزار میں ہتھیار پھینک کر فرار ہو گئے تھے۔ البتہ علی جاندار نکلا۔ سینہ سپر رہا، شاید اس لیے کہ وہ ناز و نعم کا پروردہ نہیں تھا۔ وہ بچپن ہی سے جذبوں کے گرم و سرد کا چشیدہ تھا، جفاکش تھا، بے رخی اور بے وفائی کا عادی تھا۔

ابو کی بے وفائی کے بعد امی نامحسوس طریق پر علی کے قریب آ گئی تھیں۔ شاید اس لیے کہ ان کی تمام کشتیاں جل چکی تھیں اور اب انہیں ساحل تک پہنچنے کا صرف ایک راستہ نظر آ رہا تھا ___ صرف ایک کمزور تختہ جس کے پیندے میں سوراخ تھا، ان کی دسترس میں تھا۔ مگر انہیں بہر طور اسی کے سہارے پُر آشوب سمندر عبور کرنا تھا۔ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

علی جانے کتنی دیر اپنے بستر پر لیٹا سگریٹ پہ سگریٹ سلگائے انہی سوچوں میں غلطاں و پیچاں رہا۔ آخر حسین بھائی آ گئے اور آتے ہی اپنے بستر پر دراز ہو گئے، جیسے میلوں کا سفر کر کے لوٹے ہوں۔ ان کے چہرے پر وحشت صحرا کی طرح بکھری تھی۔ علی اٹھ کر ان کے پلنگ پر ان کے قریب بیٹھ گیا۔ پھر وہ ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر سہلانے لگا۔

"کیا بات ہے؟ آپ اتنے گھبرائے ہوئے لگتے ہیں اور یہ آپ کہاں چلے گئے تھے؟ اتنی دیر لگا کر آئے ہیں۔ میں آپ کا انتظار کر رہا تھا۔"

حسین بھائی سیدھے لیٹے ٹکٹکی باندھے چھت کو دیکھتے رہے، پھر بولے۔

"میں ذرا باغ جناح تک چلا گیا تھا، واک کے لیے۔ وہاں اتنے لوگ تھے ___ اتنے لوگ تھے کہ میرا دم گھٹنے لگا۔ میں گھبرا کر باغ سے نکل آیا۔ باہر بھی لوگ ہی لوگ تھے ___ ہجوم در ہجوم ___ انبوہ در انبوہ۔

میں جانے کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ کن سڑکوں پر چلتے چلتے، لیکن ہر طرف آدمی

ہی آدمی تھے ___ اور علی! مجھے یوں احساس ہوا کہ جیسے یہ سارے لوگ ___ لاکھوں کی تعداد میں، سڑکوں پر نکل آئے ہوں۔ میری آنکھیں ایکس ریز کی طرح ان کے دل تک اتر گئیں اور میں ان کی اصلیت کو دیکھ سکتا تھا۔ ظاہری لباس کے اندر سے ان کا باطن عریاں تھا۔ ان میں سے بعض بھوکے ننگے تھے، جسموں کی ہڈیاں نکلی ہوئیں۔ بعض دوسرے تھے، جن کے دل حرص سے لتھڑے ہوئے تھے ___ اور یہ سب بھوک اور حرص سے بوکھلائے لوگ جانے کیوں اور کدھر بھاگ رہے تھے ___ چیختی، دھواں اگلتی گاڑیوں، ویگنوں اور چنگھاڑتے رکشاؤں پر۔"

حسین بھائی نے علی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ انہیں ہلکا سا پسینہ آرہا تھا۔ "علی! مجھے خوف آتا ہے ان لوگوں سے، مجھے ان کے ہجوم بھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

علی نے حسین بھائی کا ہاتھ پیار سے سہلاتے ہوئے کہا۔ "آپ کو چاہیے کہ کچھ دنوں کے لیے عائشہ پھوپھی کے پاس اسلام آباد ہو آئیں۔ وہاں کھپ بھی نہیں اور جگہ بھی پُرفضا ہے۔"

حسین بھائی کچھ دیر بحثتے رہے۔ حسب معمول حیل وحجت سے کام لے رہے تھے۔ اسلام آباد جانے کے لیے رضامند نہ تھے۔ بالآخر طویل بحث مباحثے کے بعد ہتھیار ڈال دیئے۔ بس طے ہوا کہ جونہی علی کی چھٹیاں ختم ہو گئیں وہ اکیڈمی واپس چلا جائے گا، حسین بھائی بھی اسلام آباد چلے جائیں گے۔ اس لمبی گفتگو کا فائدہ یہ ہوا کہ حسین بھائی کے تنے ہوئے اعصاب قدرے ڈھیلے پڑ گئے۔ آہستہ آہستہ ان کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں۔ علی نے جھک کر ان کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ حسین بھائی مسکرا اٹھے۔ ان کی مسکراہٹ میں سکون تھا۔ خود علی کو اس بوسے سے طمانیت اور مسرت کا احساس ہوا، جیسے آج علی نے بچپن کی رسوائیوں والی اُس رات کا قرض چکا دیا ہو، جب حسین بھائی نے اس کی

انگارہ جیسے ماتھے پر اپنے بوسے سے ذلت کا داغ مدہم کر دیا تھا۔

حسین بھائی اب میٹھی نیند سو رہے تھے۔ علی اٹھا، جوتے اتارے اور آہستگی سے حسین بھائی کے ساتھ لیٹ گیا۔ وہ پُر سکون تھا۔ اس کے من آنگن میں کوئی شور، کوئی ہلچل نہیں تھی۔ بس ہوا چل رہی تھی ___ دبے پاؤں۔

دھوپ ہر طرف پھیلی تھی، لیکن قد آور درختوں کے نیچے خنکی تھی۔ علی باغ میں واقع لائبریری کی دائیں جانب درختوں سے ڈھکی سڑک سے نکلا تو اُس نے دیکھا کہ لائبریری کے صدر دروازے سے ایک درمیانہ عمر کی خاتون برآمد ہو رہی تھی، بھورے بال، رنگت کی انتہائی سفیدی میں گلاب کا عکس، متناسب جسم، ایک ہاتھ میں کتابیں تھیں، جنھیں وہ سنبھالنے کی کوشش میں مصروف تھی اور اسی لیے اس کی نگاہیں کتابوں پر مرکوز تھیں۔

علی کے قدم رک سے گئے۔

"مس ڈینیل!"

اور علی کا دل بلیوں اچھل پڑا۔

مس ڈینیل سکول میں علی کی پسندیدہ استاد تھیں۔ اسے آج بھی وہ دن واضح طور پر یاد تھا، جب وہ پہلی مرتبہ سکول گیا تھا ___ نیکر پہنے اپنی پتلی پتلی نازک ٹانگوں کے ساتھ۔ اس وقت وہ کلاس ون میں پڑھنے والے بچوں کی نسبت بڑا تھا۔ کیوں کہ بچپن میں مسلسل بیمار رہنے کے سبب وہ صحیح وقت پر سکول میں داخل نہیں ہو سکا تھا۔ اسی لیے جب علی پہلے دن کلاس روم میں داخل ہوا تو جھینپا اور گھبرایا ہوا تھا۔ وہ دوسرے بچوں سے عمر میں بڑا ہونے کے سبب شرمسار سا تھا، مگر مس ڈینیل فوراً آگے بڑھیں اور اس کو خوش آمدید کہا۔ پھر گرم جوشی سے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر اسے اس کی کرسی پر بٹھایا اور کلاس ون کے سب بچوں سے اس کا تعارف کروایا۔ علی مسرور ہو کر مس ڈینیل کی طرف دیکھ کر مسکرایا تو

انہوں نے بے ساختہ کہا۔ "دیکھو بچو! علی کی مسکراہٹ کس قدر خوبصورت ہے!" علی کا مان بڑھا، اعتماد بحال ہوا اور وہ اپنی کمزور سوکھی ہوئی ٹانگوں پر مضبوطی سے کھڑا ہو گیا۔

اس کے بعد علی اور مس ڈینیل کے درمیان یگانگت کا جو تعلق استوار ہوا، وہ جاری رہا۔ حتیٰ کہ علی سرگودھا کیڈٹ سکول منتقل ہو گیا۔ سرگودھا کیڈٹ سکول سے لے کر ائیر فورس اکیڈمی میں منتخب ہو جانے تک اس کی مس ڈینیل سے کوئی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔ آج اچانک انہیں باغ میں لائبریری سے نکلتے دیکھ کر علی اس ملاقات کے غیر متوقع پن سے یوں مسرور ہوا، جیسے کوئی بچہ کسی کتاب میں مور کا خوبصورت پَر رکھ کر بھول گیا ہو، برسوں بعد وہ کتاب اُس کے ہاتھ لگے اور اس کے ورق الٹتے ہوئے یکدم وہ سبز، نیلے، چمکیلے رنگوں والے مور کے پَر کو دیکھ کر خوشی سے جھوم اٹھے۔

"مس ڈینیل!" علی نے پکارا۔

مس ڈینیل نے اپنی نظریں ہاتھ میں تھامی کتابوں سے اٹھا کر اُس کی جانب دیکھا۔ ان کے چہرے پر دھوپ نکھر آئی اور آنکھیں دمک اٹھیں۔

"اوہ! علی! ہاؤ آر یو؟"

"فائن، مس ڈینیل۔"

مس ڈینیل اور علی کچھ دیر مسرور خاموشی سے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔

"اٹس ریلی گڈ ٹو سی یو اگین۔" علی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تھینک یو۔"

کچھ دیر مس ڈینیل چپ چاپ اس کا جائزہ لیتی رہیں، پھر بولیں۔ "یور سمائل از ایون ناؤ ویری بیوٹی فل۔"

علی کے کانوں کی لویں سرخ ہو گئیں۔

کچھ دیر وہ دونوں یونہی ایک دوسرے کی قربت سے سرشار رہے۔

پھر مس ڈینیل بولیں۔ "علی! کیوں نہ کہیں بیٹھ کر باتیں کریں۔نہیں___ میرا خیال ہے تم کل میرے گھر آ جانا۔ وہیں رات کا کھانا بھی کھائیں گے اور باتیں بھی ہو جائیں گی۔"

علی کا سفید رنگ خوشی سے ارغوانی ہو گیا۔

"جی بالکل،شکریہ،مگر آپ کا پتہ___ ؟ کیا آپ وہیں رہتی ہیں؟"

"ہاں،تو پھر خدا حافظ۔کل آ جانا وقت پر،پھر خوب باتیں ہوں گی۔"

مس ڈینیل یہ کہہ کر ہاتھ ہلاتے ہوئے کار پارک کی طرف مڑ گئیں۔

علی دوسرے دن وقتِ مقررہ پر مس ڈینیل کے گھر پہنچ گیا۔مس ڈینیل کا گھر کافی پرانا تھا۔انہیں اپنے والدین سے ورثہ میں ملا تھا۔یہ فیروز پور روڈ کی ایک قدیم کوٹھی تھی___ ہندوؤں کے وقت کی۔کوٹھی کے در و دیوار حوادثِ زمانہ کے شاہد تھے۔اسے ہر طرف سے مختلف قسم کی بیلوں نے گھیر رکھا تھا۔کوٹھی کے گرد بنی روشوں پر بیلوں نے چھتر سا تان دیا تھا۔بعض دفعہ یوں احساس ہوتا تھا کہ جیسے کسی نے بیلوں کے اندر آشیانہ بنا رکھا ہو۔

علی نے برآمدے میں لگی گھنٹی بجائی تو مس ڈینیل خود دروازہ کھولنے کے لیے آئیں۔انہوں نے علی کا پُر جوش استقبال کیا۔مس ڈینیل پیازی رنگ کے لباس میں خوب کھلی ہوئی تھیں۔وہ رسمی سی گفتگو کے بعد علی کو ڈرائینگ روم میں بٹھا کر خود ملازم کو کھانے کے بارے میں ہدایات دینے چلی گئیں۔

علی نے ان کے جانے کے بعد کمرے کا جائزہ لیا۔صوفہ سیٹ پر نیلے رنگ کی ویلوٹ چڑھی تھی،جو برسوں کی گرد سے مرجھا سی گئی تھی۔کمرے کے وسط میں کابلی قالین اپنے روایتی نقش و نگار کے ساتھ بچھا تھا۔مصنوعی آتشدان کے اوپر ۱۲×۱۰ کے سائز کی پکاسو

کی ایک تصویر کا پرنٹ سنہری فریم میں فٹ تھا۔ پکاسو کی بنی ہوئی اس تصویر میں صرف نیلا رنگ اور اس کے مختلف شیڈز استعمال کیے گئے تھے۔ تصویر ایک اندھے گٹارسٹ کی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ تمام تر تصویر تکونوں سے تیار کی گئی تھی، مگر اندھے گٹارسٹ کے وجود کی تمام تکونوں سے کرب ٹپک رہا تھا۔

علی کی نگاہیں دیر تک تصویر پر مرکوز رہیں۔

"کیا دیکھ رہے ہو؟" مس ڈینیل نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پوچھا۔

علی جھینپ گیا۔

"جی ___ جی کچھ نہیں۔ بس یونہی ذرا اس تصویر میں الجھ سا گیا تھا۔"

"ہاں لگتا ہے۔" مس ڈینیل نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "دراصل مجھے خود بھی پکاسو کی یہ تصویر اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اسی لیے تو اسے فریم کروا کر ڈرائینگ روم میں رکھا ہے۔"

تھوڑے سے وقفے سے مس ڈینیل پھر بولیں۔ "خیر چھوڑو۔ اپنی سناؤ۔ اتنے سال کہاں کہاں رہے؟ کیا گذری؟ اب کیا کر رہے ہو؟"

علی نے انہیں بتایا کہ کیسے وہ کیڈٹ سکول سرگودھا گیا۔ وہاں سے ہو کر پی۔اے۔ ایف اکیڈمی پہنچا۔ پھر اس نے مس ڈینیل سے سکول کا حال پوچھا۔ باقی اساتذہ کے بارے میں دریافت کیا۔ انہوں نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ کون ریٹائر ہو چکا تھا۔ کس کس نے کسی اور جگہ ملازمت اختیار کر لی تھی۔ کس کس کی شادی ہو چکی تھی اور کون سے نئے افراد سکول کے سٹاف میں شامل ہو چکے تھے۔

اتنے میں ملازم نے اطلاع دی کہ کھانا لگ چکا ہے۔ مس ڈینیل علی کو کھانے کے کمرے میں لے آئیں۔ کمرہ درمیانہ جسامت کا تھا۔ بیچ میں ایک بیضوی شکل کی لکڑی کی میز تھی اور اس کے گرد پرانے یورپین سٹائل کی اونچی پشت والی کرسیاں تھیں۔ پُر تکلف کھانا

سلور کے قیمتی برتنوں میں سجا تھا۔ لیکن جس چیز نے علی کو حیرت میں ڈال دیا، وہ کمرے میں بجلی کے بلب یا ٹیوب کی عدم موجودگی تھی۔ البتہ میز کے درمیان چاندی کے دو بلند شمع دانوں میں بڑی بڑی موم بتیاں روشن تھیں۔

مس ڈینیل نے بیضوی میز کے ایک سرے پر خود بیٹھتے ہوئے دوسرے سرے کی کرسی پر علی کو بیٹھنے کے لیے کہا۔ اب وہ دونوں میز کے انتہائی سروں پر آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ علی ذرا کھو سا گیا تھا۔ اس کی نگاہیں بار بار شمع دانوں کی طرف جاتی تھیں۔ مس ڈینیل بھانپ گئی تھیں کہ علی کی حیرت کا سبب کیا ہے۔

"غالباً تم سوچ رہے ہو کہ کمرے میں موم بتیاں کیوں روشن ہیں، جب کہ ہم ایک بڑے اور بجلی کی سہولت سے آراستہ شہر کے درمیان بیٹھے ہیں۔ دراصل بجلی کی روشنی بڑی سنگدل ہوتی ہے۔ بڑی بے رحمی سے اشیاء کو عریاں کرتی ہے، جب کہ موم بتی کی روشنی میں ایک حسن اور پُر اسراریت ہے ___ اور مجھے حسن اور پُر اسراریت سے عشق ہے۔" مس ڈینیل اپنی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ بولیں۔

"جی، یہ تو صحیح ہے۔" علی نے ہنستے ہوئے کہا۔ "واقعی مجھے محسوس ہو رہا ہے، جیسے ہم لوٹ گئے ہیں ___ پرانے زمانے کی طرف، چند صدیاں بیچ میں سے غائب ہو گئی ہیں۔"

"یا اس سے بھی پیچھے چلے گئے ہیں، جب پہاڑی پتھروں سے تعمیر شدہ قلعے تھے، جگر دار سورما جیالے مہمات کی جستجو میں پھرتے تھے اور حسین دوشیزاؤں کو ظالموں کے پنجے سے نجات دلاتے تھے۔"

"جی ___ آپ وہ حسینہ ہیں ___ اور میں وہ جیالا سورما۔"

علی نے شوخی سے کہا۔

جواب میں مس ڈینیل کی دلفریب ہنسی سنائی دی۔

"ویسے آپ کی کوٹھی کافی پرانی ہے۔"

"ہاں، میرے دادا نے کسی ہندو سے خریدی تھی۔"

"اسے دیکھ کر مجھے یاد آتی ہے___"

علی کچھ کہتے کہتے رک گیا۔ شاید کوئی غلط بات تھی۔

"نامناسب، غالباً شمعوں سے روشن فضا کے خمار کا اثر ہے۔" علی نے پچھتاتے ہوئے سوچا اور ساتھ ہی اس نے لب بھینچ لیے۔

پھر مس ڈینیل نے شرارت سے کہا۔" کہیں تخیل کی اس مشق میں تم بالآخر یہ نہ کہہ دو کہ میں چارلس ڈکنز کے ناول کا کردار ہوں۔"

" کون سا؟"

"چارلس ڈکنز کے مشہور ناول "Great Expectations" کا ایک اہم کردار، جس سے اس کا محبوب بے وفائی کرتا ہے۔ عین شادی کے دن غائب ہو جاتا ہے اور وہ ہمیشہ کے لیے عروسی جوڑا زیب تن کیے اپنے شاندار گھر میں محصور ہو جاتی ہے۔

اس کا شاندار گھر پرانا ہو جاتا ہے اور سبزہ در و دیوار پر اگنے لگتا ہے۔ اس کے لیے وقت ٹھہر جاتا ہے۔ ہر چیز تار عنکبوت بن جاتی ہے۔ حتیٰ کہ اس کا چہرہ اور جسم بھی___ مگر وہ اپنے عروسی جوڑے میں آتشدان کے پاس ہی بیٹھی رہتی ہے۔ وہ ایک لڑکی کو گود لیتی ہے اور اُسے مردوں سے انتقام لینا سکھاتی ہے۔"

"خدا کے لیے، بس کریں۔ مس ڈینیل!"

"ارے! تم تو سہم گئے ہو۔ میں نے تو ایسے ہی دل لگی کے لیے یہ کہانی بیان کرنی شروع کر دی تھی۔ ورنہ میں نے تو کبھی عروسی جوڑا نہیں پہنا، نہ کسی کی یاد کو قبر بنا کر اس میں اتری ہوں اور نہ میرا ذہنی توازن بگڑا ہوا ہے کہ مرد ذات سے انتقام لینے کا کوئی بلیو پرنٹ تیار کروں۔"

مس ڈینیل مسلسل ہنس رہی تھیں، کھل کر اور بے تکلفی سے جیسے کوئی آبشار گر رہی ہو۔

"خیر چھوڑو ان باتوں کو، کچھ کھاؤ۔ سب چیزیں ویسی ہی رکھی ہیں۔" مس ڈینیل نے مرغ کے کباب کی پلیٹ علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

کھانے کے بعد بھی ہلکی پھلکی باتیں جاری رہیں۔ علی نے رات گیارہ بجے کے قریب رخصت ہونے کی اجازت چاہی۔ مس ڈینیل اسے باہر برآمدے تک چھوڑنے کے لیے آئیں۔

"ویسے علی! رات بہت ہو گئی ہے۔ پتہ نہیں اس وقت کوئی سواری ملے نہ ملے۔ میں کار میں نہ چھوڑ آؤں تمہیں تمہارے گھر۔"

"نہیں نہیں۔ آپ تکلیف نہ کریں۔ کوئی نہ کوئی سواری یقیناً مل جائے گی۔"

"اور نہ ملی تو___؟"

"تو کچھ نہیں، میں پیدل مارچ کروں گا۔ آخر فوج کی تربیت کس دن کام آئے گی۔"

"اچھا بھئی! میں ہاری تم جیتے۔"

اور مس ڈینیل نے ہنستے ہوئے ہاتھ ہلا کر علی کو رخصت کیا۔

جب علی مس ڈینیل کے گھر سے نکلا تو باہر سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ بادل نیچے جھک آئے تھے۔ بوندا باندی شروع ہو چکی تھی اور ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ دور دور تک کہیں کسی رکشا یا ٹیکسی کا نشان تک نہ تھا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی گرم ٹوپی پہن لی، گردن کے گرد مفلر لپیٹا اور اللہ کا نام لے کر پیدل چلنا شروع کر دیا۔ بالآخر چونگی کے قریب اُسے ایک رکشا مل گیا۔ وہ رکشا میں بیٹھ گیا۔ رکشا والے کو اپنے گھر کا پتہ بتانے کے بعد اس نے

سگریٹ سلگا لیا۔ کیوں کہ رکشا کے دونوں اطراف پلاسٹک کے دروازے لگے تھے، اس لیے ہوا کے زور سے سگریٹ بجھنے کا بہت کم امکان تھا۔

خالی سنسان سڑکوں پر رکشا کے انجن کی گرج گونج پیدا کر رہی تھی۔ علی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی سائنس فکشن مووی میں کسی سپیس شپ (Space Ship) کے اندر خلا میں سفر کر رہا ہے۔ آہستہ آہستہ اس کی توجہ باہر کے شور سے ہٹنے لگی۔ رکشا کی گرج مدہم ہونے لگی۔

سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے علی نے سوچا۔ "کچھ لوگ وقت کے غبار میں گم ہو جاتے ہیں اور آدمی سوچتا ہے کہ وہ ہمیشہ کے لیے کھو گئے ہیں۔ مگر کبھی کبھی ___ اچانک ___ یہ غبار چھٹ جاتا ہے تو کھو جانے والے سامنے کھڑے ہوتے ہیں ___ جنہیں ہم نے کھو دیا تھا، انہیں ہم ایک بار پھر پا لیتے ہیں۔"

پھر اس نے قدرے اداسی سے سوچا۔ "لیکن اگر آدمی خود وقت کے غبار میں بھٹک جائے، تو کیا وہ کبھی اپنے آپ کو پا سکتا ہے؟"

رکشا اُس گلی کے نکڑ پر پہنچ چکا تھا، جس میں علی کا گھر تھا۔ یہ گلی اُس کے گھر کے قریب بند ہو جاتی تھی اور اتنی تنگ تھی کہ رکشا واپس کرنا آسان نہ تھا۔ اس لیے علی نے رکشا وہیں روک لیا۔ کرایہ ادا کرنے کے بعد وہ چستی سے چلتا ہوا اپنی گلی میں داخل ہو گیا۔ مس ڈینیل سے ملاقات کا خمار اب بھی اس کے وجود پر چھایا ہوا تھا۔

۳

علی کی تعطیلات ختم ہو چکی تھیں۔ جب وہ مس ڈینیل کے ہاں ڈنر کے لیے گیا تھا تو ابھی اُس کی چار چھٹیاں باقی تھیں۔ ان میں سے دو اُس نے اپنے خاندان کے ساتھ گذاریں اور باقی ماندہ مس ڈینیل کے ساتھ۔ ایک شام علی اور مس ڈینیل لمبی ڈرائیو پر شہر سے باہر گئے۔ دوسرے دن مس ڈینیل نے اُسے موسیقی کی ایک تقریب پر مدعو کیا، جو رات گئے ختم ہوئی۔ بہرحال اب وہ واپس اکیڈمی پہنچ چکا تھا، اگرچہ مس ڈینیل کے ساتھ بیتے وقت کی یاد ایک سہانے خواب کی طرح اس کی ہمرکاب تھی۔

جب علی اکیڈمی کے کیمپس میں داخل ہوا تو شام درختوں پہ جھک آئی تھی۔ وہ صبح سویرے گھر سے چل پڑا تھا تا کہ کوئی خطرہ مول لئے بغیر وقت مقررہ پر حاضر ہو سکے، ورنہ فوجی نظم و ضبط کے تحت اُسے ڈانٹ کے علاوہ سزا بھی مل سکتی تھی۔

علی نے اپنے کمرے میں سفری بیگ رکھنے کے بعد سوچا کہ نہا لے، تا کہ سفر کا گردو غبار جسم سے دھل جائے۔ اسی خیال سے وہ کامن باتھس کی طرف تولیہ لے کر گیا۔ گرم پانی

سے نہانے کے بعد وہ تازہ دم باہر نکلا تو ساتھ والے باتھ روم سے عثمان برآمد ہوا۔ وہ علی ہی کے بیج کا کیڈٹ تھا۔ عثمان لمبا، چوڑا اور خوش شکل نوجوان تھا۔ اس وقت اس نے بے تکلفی سے نہانے کا بڑا تولیہ اپنے دھڑ کے گرد لپیٹا ہوا تھا اور اوپر کوئی قمیص یا بنیان نہیں پہنی ہوئی تھی۔ علی اور وہ اب تک محض رسمی طور پر ایک دوسرے سے ملتے تھے۔ دونوں کے درمیان سرسری سی واقفیت تھی۔

"کیا حال ہے بھئی؟ واپس آ گئے؟" عثمان نے علی کو دیکھ کر کہا۔

"ہاں۔"

"چھٹیاں کیسی گذریں؟"

"اے۔ ون۔"

علی عثمان کی باتوں کا جواب دے رہا تھا، لیکن اس کی نگاہیں عثمان کے چوڑے چکلے سفید سینے پر مرکوز تھیں۔ دراصل وہ یہ دیکھ رہا تھا کہ سفید پس منظر میں سیاہ بالوں کے گچھے کس قدر دلفریب دکھائی دے رہے ہیں۔ اس سے پہلے اُسے عثمان کے عریاں حسن کو دیکھنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔

"یوں لگتا ہے ابھی تو بہت کم لڑکے واپس آئے ہیں۔ Dorm سونی سونی لگ رہی ہے۔" عثمان بولا۔

"ہاں۔" علی نے بے دھیانی سے جواب دیا۔

"علی! یوں کرو کہ اپنے کمرے میں میرا انتظار کرو۔ میں ابھی کپڑے پہن کر تمہارے پاس آتا ہوں۔ پھر اکٹھے میس کی طرف چلتے ہیں۔ او۔ کے۔"

"او۔ کے۔"

عثمان ہاتھ ہلاتا ہوا کوریڈور کی دیوار کے ساتھ دائیں جانب مڑ گیا، جس طرف اس کا کمرہ تھا۔

جب علی اور عثمان میس میں پہنچے تو نیچے کے دونوں ہال خالی تھے۔ گیلری سے لٹکتے رنگ برنگے جھنڈوں کو دیکھ کر نجانے کیوں علی کو افسردگی سی محسوس ہوئی، جیسے باسی پھولوں کی مہک کی اداسی، یا پھر یہ واپس اکیڈمی آنے کا تاسف تھا۔ علی اور عثمان بل کھاتی ہوئی سیڑھیوں سے اوپر کی منزل میں چلے گئے۔ میس کی عمارت سے گھرا صحن اوپر کی منزل سے صاف دکھائی دے رہا تھا۔ یہ صحن جس کے بیچوں بیچ فوارے کی جگہ رکھی گئی تھی، فوارے کے بغیر مفلوک الحال معلوم ہو رہا تھا۔ علی کو ہمیشہ یہاں فوارے کی کمی کا احساس ہوتا تھا۔ اصل میں عمارت کے نقشے میں یہاں فوارہ موجود تھا، مگر نامعلوم وجوہات کی بنا، پر اُسے یہاں نصب نہیں کیا گیا تھا۔

علی اور عثمان نے ٹی، وی روم میں جھانکا۔ وہاں لڑکوں کی خاصی تعداد بیٹھی نظر آئی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئے تو محسوس ہوا کہ فضا میں جوش وخروش موجود ہے۔ وی۔ سی۔ آر پر صوفیہ لورین کی کوئی فلم چل رہی تھی، جو ذوق وشوق سے دیکھی جا رہی تھی۔ ساتھ میں سرگوشیاں بھی جاری تھیں۔ علی اور عثمان تیسری رو میں پچھی کرسیوں پر ٹک گئے۔ رات کے کھانے تک کسی طور وقت بھی تو ہلاک کرنا تھا۔ دونوں نے سوچا کیوں نہ فلم ہی دیکھ لی جائے۔ آدھی فلم ان کے آنے سے پہلے ہی گذر چکی تھی، سو انہوں نے باقی ماندہ یعنی صرف پینتالیس منٹ کے دورانیے کی فلم دیکھی۔

فلم کے اختتام پر عثمان اور علی کافی شاپ میں آ گئے۔ عثمان نے کافی کی دو پیالیوں کا آرڈر دیا۔ دونوں ایک میز پر بیٹھ گئے۔ عثمان نے علی سے ہنستے ہوئے فلم کے بارے میں اس کی رائے پوچھی۔

"اچھی تھی۔" علی نے مبہم سا جواب دیا۔

"اور صوفیہ لورین ___؟"

"وہ بھی اچھی ہے۔"

"صرف اچھی؟" عثمان کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"اور کیا؟" علی نے ناسمجھی سے پوچھا۔

"یار! تم بھی حد کرتے ہو۔ وہ تو لاجواب سمجھی جاتی ہے ___ جنس کی مکمل علامت۔"

علی شرمندہ سا ہو گیا، لیکن ڈھٹائی سے کہنے لگا۔ "اتنی تو کوئی بات نہیں اس میں۔"

"اچھا بتاؤ تمھیں کون سی اداکارہ یا اداکارائیں پسند ہیں؟ کچھ تمہارے ذوق کا بھی تو پتہ چلے۔"

علی کی خفت میں اضافہ ہو گیا اور اس کی رنگت گلابی ہو گئی۔

"بھئی! دراصل مجھے ہیروئن پر زیادہ غور کرنے کی عادت نہیں۔"

"اور ہیرو پر ___؟"

"ہیرو ___؟ ہاں اُن کے بارے میں، میں تمھیں اپنی پسند بتا سکتا ہوں۔ ویسٹرن مووینز کے ہیروز میں مجھے کلنٹ ایسٹ وڈ پسند ہے۔ اس کے علاوہ چارلس برانسن اور سٹیو میکوین۔"

"یعنی سارے ٹف گائیز (Tough guys)"

"ہاں بھئی۔"

"سب مردانگی کے نمونے ___ اور مردانہ حسن کے کون سے نمونے پسند ہیں؟"

یہ کہتے ہوئے عثمان کے چہرے پر چلبلا پن تھا، لیکن اس کے لہجے میں طنز کا شائبہ تک نہ تھا۔

"شان کونیرے۔"

"خیر یہ جواب تو درست ہے۔ شان کونیرے کو تو Sex symbol سمجھا جاتا

ہے۔ مگر صوفیہ اور ین کے بارے میں___" عثمان نے بغور علی کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔
"معلوم ہوتا ہے تم ابھی بیدار نہیں ہوئے۔"

پھر عثمان نے ایک قہقہہ لگایا۔ عثمان کی چھیڑ سے علی کے سارے جسم میں گرمی کی لہر سی دوڑ گئی اور اس کا چہرہ اور کانوں کی لویں سرخ ہو کر جل اٹھیں۔ علی میں عثمان کی یہ چھیڑ چھاڑ برداشت کرنے کا مزید حوصلہ نہ تھا۔ اچھا ہوا کہ عثمان کا ایک دوست کافی شاپ میں آ پہنچا۔ عثمان اس سے باتوں میں محو ہو گیا۔ علی بھی یہ موقعہ غنیمت جانتے ہوئے ایک ضروری کام کے یاد آنے کا بہانہ کر کے وہاں سے کھسک گیا۔

دھوپ کھل کر چمکنے لگی تھی۔ موسم بدل چکا تھا۔ فضا کھٹی میٹھی بھینی بھینی خوشبوؤں سے مہک اٹھی تھی۔ درخت سرسبز ہو چکے تھے۔ کیاریوں میں ڈیلیا اور گلاب کھلے ہوئے تھے۔ علی اور عثمان اپنے Dorm کی دیوار اور پھولوں کی کیاریوں کے درمیان سیمنٹ سے بنی پٹی پر کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر بعد علی پٹی پر بیٹھ گیا اور سگریٹ کے کش لگانے لگا۔ عثمان دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا رہا۔ وہ فراغت کے لمحات کا لطف اٹھا رہا تھا۔

"یار! یہ شاعر لوگ بہار کے ساتھ محبت کے جذبات کو کیوں منسوب کرتے ہیں؟"
عثمان نے کیاریوں میں کھلے پھولوں اور سرسبز درختوں کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"شاید اس لیے کہ بہار زندگی کی تجدید ہے۔ مرجھائے ہوئے کھل جاتے ہیں۔ ننڈ منڈ سرسبز ہو جاتے ہیں۔ غیر متحرک متحرک ہو جاتے ہیں۔ زمین نئی چادر اوڑھ لیتی ہے۔"

علی نے سگریٹ کے دھوئیں کو نتھنوں سے اگلتے ہوئے جواب دیا۔

" کیا محبت صرف بہار میں ہی کی جاتی ہے؟ کیا صرف اسی موسم میں کسی ساتھی کی

تمنا کروٹ لیتی ہے؟"

"نہیں! محبت تو ہر موسم میں کی جاتی ہے، ہو سکتی ہے اور ہو جاتی ہے۔"

"کیا تم نے کبھی محبت کی ہے؟" عثمان نے علی کے قریب سیمنٹ کی پٹی پر بیٹھتے ہوئے دوستانہ نرماہٹ سے پوچھا۔

علی جو سگریٹ نوشی سے لطف اندوز ہو رہا تھا، مخمور نیم وا آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"سب سے پہلے تو میں نے اپنے ماں باپ سے محبت کی تھی، جو ناکام تھی ___ بری طرح۔"

"پھر کس سے کی؟"

"پھر ___ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اپنی ایک رشتے کی خالہ سے جن کی اپنے میاں سے علیحدگی ہو چکی تھی، میری طرح ان کی پہلی محبت بھی ناکام تھی ___ شاید یہی قدر مشترک تھی ہم دونوں میں۔

طلاق کے بعد وہ اکثر ہمارے ہاں آتی تھیں۔ مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ لیکن ان کا انداز محبت بھی عجب تھا۔ مجھے نہلاتی تھیں، کپڑے پہناتی تھیں، کنگھی کرتی تھیں، گلے سے لگاتی تھیں ___ اور ساتھ ہی ساتھ ان کی آنکھیں مسلسل برستی تھیں۔ وہ پہروں مجھ سے جانے کیا باتیں کرتی رہتی تھیں۔ میں اتنا چھوٹا تھا کہ اس وقت سمجھنے سے قاصر تھا۔ غالباً وہ اپنی دکھ بھری کہانی مجھے سنا کر اپنے رستے ہوئے ناسور پر پھاہا رکھنے کی کوشش کرتی تھیں۔

ایک دفعہ انہوں نے مجھے ننھے منے بوٹوں کا تحفہ بھی دیا تھا۔ مجھے وہ بوٹ اب تک یاد ہیں ___ ننھے منے سے سفید اور سرخ۔" علی نے دور خلاء میں گھورتے ہوئے کہا۔

"اور کس سے محبت کی ہے؟" عثمان نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

"اور ___ مس ڈینیل سے۔"

"وہ کون ہے؟"

"بے نہیں، ہیں۔ وہ میری کلاس ٹیچر تھیں ___ سکول میں۔"

یہ سن کر عثمان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

"یار! کبھی کسی لڑکی سے بھی کی ہے؟"

علی جھینپ سا گیا۔ اسے محسوس ہوا جیسے یہاں سے ممنوعہ علاقہ شروع ہونے والا ہے، لیکن اس نے جرأت کرتے ہوئے اور اپنی حدود کو توڑتے ہوئے انکشاف کیا۔

"ہاں ___ شاید ___ کم از کم اس وقت تو یہی محسوس ہوتا تھا۔"

پھر علی نے عثمان کو حفصہ کے بارے میں بتایا ___ اور یوں خاموشی کے اُس عہد نامے کی خلاف ورزی کی، جو اس نے اپنے آپ سے کیا تھا اور اب تک نبھایا بھی تھا کہ وہ حفصہ کے بارے میں کسی سے بات نہیں کرے گا۔

"چلو اچھا ہوا تم نے بتا دیا کہ تم نے خواتین کے علاوہ کسی لڑکی سے بھی محبت کی ہے۔"

___ پھر عثمان نے اچانک وار کیا۔ "کیا کسی لڑکے سے بھی کی ہے؟"

علی ہکا بکا رہ گیا، مگر اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے بولا۔ "یار حد ہوتی ہے مذاق کی۔"

اسے پل بھر کے لیے بابر یاد آیا تھا ___ مگر حقیقت تو یہ تھی کہ اس نے نہیں، بلکہ بابر نے اس سے محبت کی تھی۔ وہ تو محض اپنی انا کی تسکین، اپنے زخم خوردہ جذبے اور اپنے لٹے ہوئے پندار کی طمانیت کے لیے اس کی رفاقت کو قبول کیے ہوئے تھا۔ پھر بھی سچ تو یہ ہے کہ جب عثمان نے اس سے سوال کیا تو بابر کا نام اس کی نوکِ زباں پر تھا۔ لیکن وہ کمال ہوشیاری سے بابر کے ذکر کو حذف کر گیا۔ اس کے احساس کا رڈار کسی خطرے کی نشاندہی کر رہا تھا۔ کوئی آواز سرگوشی کر رہی تھی۔

"بابر کا تذکرہ عثمان سے نہیں کرنا ہے۔"

اسے کسی نامعلوم چیز نے چوکنا کر دیا تھا، ورنہ یوں تو وہ سیدھا سادا سا آدمی تھا۔

شبخون کی فوجی مشق جاری تھی۔ رات گہری تھی۔ ستارے امید کی طرح ٹمٹمار ہے تھے۔ علی اور عثمان پست قد درختوں اور بلند جھاڑیوں کے جھنگھٹ میں سانپوں کی طرح خاموشی سے رینگتے ہوئے ایک خاص مقام پر آ کے رک گئے۔ اس سے آگے انہیں خطرہ تھا کہ مخالف گروہ کا علاقہ شروع ہو چکا ہے۔ وہ ساکت و جامد پیٹ کے بل زمین پر لیٹے ہوئے تھے، اور ان کی نگاہیں دور دشمن کے ممکنہ علاقے پر مرکوز تھیں۔ کان چوکس تھے۔ ہر آہٹ پر ان کا دل دھڑک اٹھتا۔ اگر چہ انہیں معلوم تھا کہ یہ اصل جنگ نہیں، پھر بھی سارے ماحول کی ہیبت ان پر سیاہ بادل کی طرح چھائی ہوئی تھی۔ اتنے میں مخالف گروپ کے گوریلے سامنے جنگل سے برآمد ہوئے، دبے پاؤں چلتے ہوئے، لیکن چوکس۔ انہوں نے ادھر اُدھر کا جائزہ لیا، لیکن پھر اپنے حریفوں کی غیر موجودگی کی تصدیق کرنے کے بعد آگے بڑھ گئے۔ ان کے جانے کے بعد علی اور عثمان کے تنے ہوئے جسم کسی قدر ڈھیلے پڑ گئے۔ انہیں اطمینان تھا کہ خطرہ وقتی طور پر ٹل گیا ہے۔

وہ دونوں وہاں گہری رات اور سنسان جنگل میں پیلے پھولوں والی جھاڑیوں کے نیچے قریب قریب ___ اتنے قریب لیٹے ہوئے تھے کہ ان کے جسم ایک دوسرے سے مس کر رہے تھے۔ ایک کی ہلکی سی لرزش بھی دوسرے کو محسوس ہو رہی تھی۔ وہ جب ایک دوسرے کی طرف دیکھتے تو چہروں کی قربت کے باعث ایک دوسرے کے سانس کی ہواڑ محسوس کرتے۔ یکدم علی کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ لمحہ بہ لمحہ اس کی دھڑکن میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا، جیسے کوئی سرکس میں موٹر سائیکل پر سوار آنکھوں پر پٹی باندھے موت کے کنوئیں کی ڈھلانوں پر چکر لگا رہا ہو۔

کہیں پھڑپھڑاہٹ سی ہوئی۔ کوئی پرندہ کسی درخت کی شاخ پہ مضطرب تھا۔ علی پر کسی انجانے خطرے کا ہول چھاتا چلا جا رہا تھا___ سیلِ رواں کی طرح جس میں سوکھی چٹختی لکڑیاں، تناور درخت اور بند، سب کچھ بہہ جاتا ہے___ نیست و نابود ہو جاتا ہے۔ یہ کسی انہونی کا الاپ تھا، جس کے سُر شدید سے شدید ہوتے چلے جا رہے تھے۔

علی شاخ پہ بیٹھے پرندے کی طرح پھڑپھڑایا۔ اب اس میں مزید برداشت کی سکت نہ تھی۔ اس نے جست لگائی اور سرپٹ دوڑنا شروع کر دیا۔ اُسے محسوس ہوا کہ عثمان کے دہکتے جسم کا مقناطیس اسے اپنی طرف کھینچ رہا ہے___ اور وہ کشش کے حصار کو توڑ کر باہر نکلنا چاہتا تھا۔ اس نے رائفل کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے تھام کر اندھا دھند بھاگنا شروع کر دیا___ دشمن کے علاقے کی طرف۔

عثمان جو علی کی حرکت کے اچانک پن سے دم بخود تھا، کچھ دیر میں سنبھل گیا اور اس نے بھی غیر ارادی طور پر علی کے پیچھے___ اس کے تعاقب میں بھاگنا شروع کر دیا۔ دراصل وہ علی کو اس احمقانہ حرکت سے روکنا چاہتا تھا کہ وہ جانتے بوجھتے دشمن کے علاقے کی طرف جا رہا تھا۔ لیکن علی کو جیسے پَر لگ گئے تھے۔ عثمان کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ سامنے اونچے درختوں والے جنگل میں غائب ہو گیا۔

جنگل کی اندھیری کوکھ میں علی بھاگتے بھاگتے ہانپنے لگا۔ اس کا تعاقب کرنے والے قدموں کی چاپ بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ اب وہ ان کی دسترس سے محفوظ تھا۔ اس کے اوسان کسی حد تک بحال ہونے لگے۔ سوچ نے اس وقفے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے ذہن میں سوال اٹھایا۔

"میں کس سے فرار ہونے کی کوشش میں ہوں؟___ مخالف گوریلوں کا تو کہیں نام و نشان بھی نہیں، پھر کس سے؟___ عثمان سے؟___ یا پھر اپنے آپ سے؟"

تڑ، تڑ، تڑ، علی کے گرد گولیوں کی بوچھاڑ کی روشنی برسنے لگی۔ اس کا جسم فوری طور پرصورت حال سے نپٹنے کے لیے حرکت میں آ گیا۔ اس کے بعد اسے سوچنے کی فراغت نہ تھی۔ وہ مخالف گوریلوں میں گھر چکا تھا۔

۴

علی اس شبخون والی رات کے بعد جب وہ اندھا دھند مخالف کیمپ میں جا گھسا تھا، عثمان سے کترانے لگا تھا۔ مگر شائستگی کے پیشِ نظر اس کتراہٹ ___ اس گریز کو نا محسوس رکھنا چاہتا تھا۔ البتہ وہ اس سے تنہائی میں ملنے سے بچاؤ کی تدابیر پر غور کرتا رہتا۔ دراصل اس رات کی ہیبت نے علی کو اپنی گرفت میں لے لیا تھا۔ اس رات کی سیاہی میں اس کے وجود کے پاتال سے جو ایک نامعلوم آواز آئی تھی، اس کی گونج اسے اپنے خوابوں میں سنائی دینے لگی تھی۔ اکثر رات گئے وہ گھبرا کر ___ سہم کر جاگ اٹھتا۔ اس کے خوابوں میں کوئی شخص نِنجا (Ninja) کے چست سیاہ لباس میں ابھرتا، کسی نامعلوم گوشے سے جست لگا کر اس پر حملہ آور ہوتا اور اپنے فنی داؤ پیچ سے علی کو زیر کرنے کی کوشش کرتا۔ اس کا چہرہ سکی ماسک (Ski Mask) کے سبب دکھائی نہ دیتا تھا۔ بس اس کے نقاب سے دو آنکھیں چمکتی تھیں ___ ان کی چمک خیرہ کرنے والی اور ان کی درون بینی نہتہ کرنے والی ہوتی۔ جب وہ علی کو قابو کرنے کی کوشش میں اسے چھوتا تو اس کا لمس دہکتے کوئلے کی

طرح محسوس ہوتا۔

صبح نکھری ہوئی تھی۔ آسمان صاف اور چمکدار تھا۔ ایویشن کیڈٹس پرواز کی مشقوں میں مصروف تھے۔ علی بھی ایک "مشاق" طیارے میں سکواڈرن لیڈر حبیب کے ہمراہ دریائے سوات کے کنارے اُڑ رہا تھا۔ سکواڈرن لیڈر حبیب ساتھ ساتھ ہدایات دیتے جا رہے تھے۔ علی ہدایات پر صحیح عمل نہیں کر رہا تھا۔ اس کے ذہن میں ہدایات گڈمڈ ہو جاتی تھیں اور وہ انہیں یاد کرنے کے عمل میں الجھ جاتا تھا۔ سکواڈرن لیڈر حبیب کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات ابھر رہے تھے، جنہیں وہ چھپانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ علی کا دل بیٹھا جا رہا تھا کہ اب سرزنش ہوگی۔ خدا خدا کر کے مشق ختم ہوئی اور علی نے شکر ادا کیا۔

شام تک علی کے ذہن میں صبح کی پرواز کی بدمزگی قائم رہی۔ وہ سگریٹ پہ سگریٹ پھونکتا رہا حتیٰ کہ رات ہوگئی۔ رات نیم گرم تھی۔ ایک بے کیف ہوا درختوں کی چوٹیوں پر چل رہی تھی۔ علی سو رہا تھا ___ ایک بدمزہ نیند جس کی دھند میں مجا ابھر رہا تھا، اپنے جنگجویانہ رقص میں مصروف ___ وہی داؤ پیچ، وہی حربے، وہی ہتھکنڈے۔ اسی دوران مجا نے اس کی گردن اپنے ہاتھوں کے شکنجے میں لے کر دبانا شروع کر دی۔ مہیب اندھیرے نے علی کو گھیر لیا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس کا سارا جسم ٹوٹ رہا تھا۔ بے اختیار اس کے ہاتھ اپنی گردن کی طرف گئے، جیسے وہ تصدیق کرنا چاہتا ہو کہ وہ اپنی جگہ پر سلامت ہے بھی یا نہیں۔

علی بستر سے اٹھا اور میز پر رکھی سگریٹ کی ڈبیا سے ایک سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ دوبارہ سو نہیں سکے گا۔ وہ کھڑکی کے پاس کھڑا ہو گیا اور سگریٹ کے کش لینے لگا۔ باہر بادامی چاند یوکلپٹس کے درختوں کے پیچھے سے جھانک رہا تھا۔ مریل سی چاندنی باہر لان، اس سے پرے پریڈ گراؤنڈ اور اس سے آگے بیرکس میں واقع دفاتر پر

بکھری ہوئی تھی۔ اس کے منہ کا ذائقہ بدمزہ تھا۔ بدن میں اضمحلال تھا۔ ذہن میں اضطراب تھا۔ اچانک اسے ہوا کے دوش پر لہراتا ہوا مس ڈینیل کا پرتو نظر آیا ___ شمع کی لو میں مرمریں، حسین، مسکراتا ہوا، پرسکون ___ اور اس کا دل بے اختیار ان سے ملنے کو چاہا۔

صبح اٹھ کر علی نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ چھٹی کی درخواست دی۔ وہ دو مہینے سے لاہور نہیں گیا تھا۔ لہٰذا دو دن کی چھٹی کا مستحق تھا۔ اگلے دن چھٹی کی درخواست منظور ہوتے ہی وہ لاہور کی طرف روانہ ہو گیا۔

علی نے شام کے وقت لاہور پہنچتے ہی گھر سے مس ڈینیل کو فون کیا، مگر معلوم ہوا کہ وہ چرچ گئی ہوئی ہیں۔ اسے اچنبھا ہوا کہ اس کے ذہن میں صرف اتوار کے دن کے ساتھ چرچ کا تصور وابستہ تھا، اور وہ اتوار کا دن نہیں تھا جب وہ لاہور پہنچا تھا۔ رات کو اس نے دوبارہ مس ڈینیل کو فون کیا۔ اس مرتبہ کامیابی ہوئی کہ مس ڈینیل گھر پر موجود تھیں۔ علی نے ان کے ہاں آنے کی اجازت چاہی جو انہوں نے بخوشی دے دی۔ آدھ گھنٹے میں وہ ان کے گھر پہنچ گیا۔

ایک کرخت آواز والے ملازم نے علی کو ڈرائنگ روم میں بٹھا کر خود مس ڈینیل کو اطلاع دینے چلا گیا۔ علی کو خوشگوار حیرت ہوئی کہ ڈرائنگ روم کی کایا پلٹ چکی تھی۔ درو دیوار رنگ و روغن سے چمک رہے تھے۔ صوفوں پر نئی ویلوٹ چڑھی تھی۔ پرانے قالین کی بجائے دیوار تک نئی کارپٹ بچھی ہوئی تھی۔ پردے بھی نئے اور جاذب توجہ تھے۔ البتہ پکاسو کے ہاتھ کی بنی ہوئی تصویر ___ "اندھا گٹارسٹ" کا فریم شدہ پرنٹ اپنی جگہ پر موجود تھا، بلکہ نئی روغن شدہ دیوار کے پس منظر میں زیادہ اجاگر تھا۔

"ہیلو، سولجر!" مس ڈینیل نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے چہک کر کہا۔

"آپ چرچ گئی ہوئی تھیں؟"

علی کی آواز میں تعجب اور استفسار کی ملی جلی کیفیت تھی۔

"ہاں، بھئی Vespers کے لیے، یعنی نمازِ شام کے لیے۔"

"مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ اس قدر مذہبی ہیں۔"

"مذہب ___ بھئی یہ تو ایک بڑا ہی گھمبیر موضوع ہے، مگر ایک بات واضح کر دوں کہ ذاتی طور پر میں صرف مسلکِ انسانیت کی قائل ہوں۔ البتہ نجانے کیوں مجھے چرچ میں عجیب سا احساس ہوتا ہے ___ سکون کا۔ میری سوچیں نکھر آتی ہیں اور جذبے نتھر جاتے ہیں۔ بس ذہن کی دھندلاہٹ ہٹ سی جاتی ہے ___ بہرحال یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر شخص اسے محسوس کرے ___ یا کر سکے۔"

"آپ کی اردو اس قدر رشتہ ہوتی ہے کہ مجھے احساسِ کمتری ہونے لگتا ہے۔" علی نے سراہتے ہوئے کہا۔

"خیر یہ تو ذرہ نوازی ہے، ورنہ بندی کس قابل ہے۔"

مس ڈینیل نے اس جملے کے ساتھ ہی مذاق سے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر آداب کیا۔

"ویسے حیرت ہے کہ آپ اینگلو پاکستانی ہیں اور آپ کی مادری زبان انگریزی ہے، پھر بھی آپ اتنی اچھی اردو بولتی ہیں۔"

"انگریزی مادری زبان تو نہیں، البتہ پدری زبان ضرور ہے۔"

"کیا مطلب؟ ___ کیا آپ کے والد برٹش تھے اور آپ کی والدہ پاکستانی؟"

"ہاں، میری والدہ یہیں کی تھیں۔ میرے نانا مسلمان تھے۔ جانے ان پر کیا روحانی واردات بیتی کہ وہ عیسائی ہو گئے۔ یوں میری والدہ کا سارا پس منظر دیسی اور ایک لحاظ سے مسلم تھا۔ پھر میرے والد جو برٹش رائل آرمی میں کیپٹن تھے، انہوں نے میری والدہ سے شادی کر لی۔ یہ ہیں میرے شجرے کے پیچ و خم۔"

پھر مس ڈینیل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "اچھا یہ تو بتاؤ کہ تم غیر متوقع طور پر لاہور

کیسے پہنچ آئے؟"

علی کچھ دیر تک آنکھیں جھکائے سوچتا رہا۔ پھر بڑے دھیمے لہجے میں بولا۔

"میری سوچ کی ڈور، جذبوں کے تانے بانے الجھ سے گئے ہیں۔ ذہن میں انتشار ہے۔ اک غبار سا ہے، جس میں سارے راستے ستولا گئے ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

مس ڈینیل کی آواز میں ہمدردی کا لوچ تھا۔

"جب میں ایئرفورس کے لیے منتخب ہو گیا تو امی مطمئن ہو گئیں کہ بیٹے کا کیریئر بن گیا ہے، مگر مجھے تو ابھی فلائنگ کورس کو مکمل کرنا ہے، جو سب سے بڑی آزمائش ہے۔ جس میں کئی سور ما چت ہو جاتے ہیں۔"

"تم ایسا کیوں سوچتے ہو کہ تم بھی چت ہو جاؤ گے؟"

"میں جب پرواز کی مشق کرتا ہوں تو میری ساتھ والی سیٹ پر انسٹرکٹر کے بجائے ایک اندھا خوف آ بیٹھتا ہے، جو آہستہ آہستہ مجھے جکڑتا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ میرے ہاتھ، میرے بازو، میری ٹانگیں اور میرے پاؤں ___ مفلوج ہو جاتے ہیں۔ میں انسٹرکٹر کی کسی ہدایت پر بھی صحیح عمل نہیں کر سکتا۔"

"یہ خوف کس چیز کا ہے؟"

"ناکامی کا ڈر ___ ناکامیوں کی ہیبت، جو میری ہر کوشش کی نفی کرتی ہے۔"

"میرا خیال ہے تم اعصابی دباؤ کا شکار ہو۔ تم یوں کیوں نہیں سوچتے کہ ناکامی اور کامیابی دونوں زندگی کا حصہ ہیں۔ اگر تم غور کرو تو اس نتیجے پر پہنچو گے کہ سب چیزیں آخری تجزیے میں کھیل ہیں ___ وقت گذارنے کے حیلے اور بہانے ___ اور بس۔ Nothing is indispensable کوئی چیز ناقابلِ تلافی نہیں ہوتی۔ یہ محض ہمارا وہم ہے کہ کوئی ایسی چیز بھی ہے جس کا کوئی نعم البدل نہیں۔"

"مگر یہ تو روزی کا مسئلہ ہے۔"

"رزق تو انسان کسی نہ کسی طور کما ہی لیتا ہے۔ فرض کرو تم پائلٹ نہ بنو تو کچھ اور بن جاؤ گے___ کوئی اور وسیلہ___ کوئی اور راستہ نکل آئے گا۔"

"جی، یہ تو ہے۔" تفکر میں ڈوبے ہوئے علی نے کہا۔

"اس کے علاوہ اور کیا مسئلہ درپیش ہے؟"

مس ڈینیل نے اپنی دروں بین آنکھوں سے اس کے اندر جھانکتے ہوئے سوال کیا۔

علی کا چہرہ اندر کی آنچ سے آتشیں ہو گیا۔

کہیں مس ڈینیل نے میرے اندر مچا کا جنگجویانہ رقص تو نہیں دیکھ لیا؟ اس نے سوچا، لیکن پھر اپنے حواس بحال کرتے ہوئے بولا۔ "نہیں___ اور کچھ نہیں۔"

مس ڈینیل بھانپ گئی تھیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے، مگر ایک تجربہ کار سیاستدان کی طرح خاموش رہیں۔

جب مس ڈینیل علی کو رخصت کرنے کے لیے باہر پھاٹک تک آئیں تو انہوں نے وہاں عشق پیچاں سے لدی دیوار کے قریب، گل چیں کے پیڑ کے نیچے علی کے چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں لیا، اور اس کے جلتے ماتھے پر اپنے مسیحا لب ثبت کر دیے۔ اس بوسے کا سکون علی کی روح تک اتر گیا۔ اس کے اندر آنچ مدہم ہونے لگی۔

اس رات علی مدت کے بعد ایک گہری، بے خواب اور میٹھی نیند سویا، جس میں اسے مچا کے بڑھتے ہوئے جارحانہ قدموں کی چاپ سنائی نہیں دی۔

۵

دن گھنٹے جا رہے تھے۔ پرواز کی مشقیں جاری تھیں، مگر علی کو افسردہ اور مضطرب کر دیتی تھیں۔ عثمان کسی اور لڑکے میں دلچسپی لے رہا تھا۔ علی خود بھی عثمان سے گریزاں تھا، لیکن اس کے ساتھ ساتھ شدید رقابت کا شکار بھی تھا۔ اس کے اندر دھوپ چھاؤں کا کھیل تھا اور خارج میں سنگلاخ حقائق۔ اسی دوران اکیڈمی میں سالانہ تقریری مقابلے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ طلباء اور طالبات ملک بھر کے تعلیمی اداروں سے وقتِ مقررہ پر شرکت کے لیے آنا شروع ہو گئے۔ اس گہما گہمی میں علی کی توجہ کسی حد تک بٹ گئی۔

علی تقریری مقابلے کے دوسرے روز میس کے صدر دروازے سے نکل رہا تھا کہ سیڑھیوں پر کھڑی دو لڑکیوں کو دیکھا، جو آپس میں کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ ان میں سے ایک زہرا تھی ___ گندمی رنگت، سیاہ بالوں والی، ایک اوسط درجے کی مقررہ، لیکن منہ پھٹ، دیدہ دلیر، خباثت کی حد تک شرارتی، غضب کی خود بیں، بلا کی پُر اعتماد اور لڑکوں سے جلد بے تکلف ہو جانے والی۔ زہرا ہر وقت آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے رکھتی تھی۔ اس ہمہ وقت سیاہ

چشمے کی حکمت شاید یہ تھی کہ وہ اپنی آنکھوں کی کیفیت کو عیاں نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ خود چھپ کر دوسروں پر وار کرنے کی عادی تھی۔

جب علی ان دونوں لڑکیوں کے پاس سے اپنی خاکی وردی میں ملبوس، سر پر سائیڈ کیپ سجائے گذرا، تو وہ اپنی دانست میں بے حد خوبرو لگ رہا تھا۔

"علی___!"

علی اپنے فوجی جوتے کی ایڑی پر چستی اور خوبصورتی سے گھوما اور ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

"جی___؟ فرمائیں۔"

"دیکھیں علی! ہمیں کل فائنل مقابلے کی تیاری کے لیے چند کتابیں درکار ہیں۔"

"جی، جی۔" علی ہمہ تن گوش تھا۔

"یہاں لائبریری تو ہے نا۔"

"ہاں جی، بہت عمدہ لائبریری ہے۔"

"کیا آپ ہمیں لائبریری تک پہنچا سکتے ہیں؟"

"جی، کیوں نہیں۔"

دونوں لڑکیاں اور علی لائبریری کی طرف چل پڑے۔ راستے میں جا بجا کیڈٹس دو دو، تین تین کی ٹولیوں میں کھڑے علی کو رشک سے دیکھتے رہے۔ وہ خود بھی اپنی اس غیر متوقع فتح پر اترا رہا تھا کہ دو فیشنل ایبل حسیناؤں کا ہمرکاب تھا۔ راستے میں ہلکی پھلکی نوعیت کی باتیں بھی جاری رہیں۔ علی سے گفتگو میں زیادہ تر باتیں زہرا نے کیں، اس کی ساتھی سوائے ایک دو دفعہ لقمہ دینے کے زیادہ تر خاموش تماشائی بنی رہی۔

"علی! آپ یہاں کب سے ہیں؟" زہرا نے پوچھا۔

"یہ میری آخری ٹرم ہے۔ بس فلائنگ کورس مکمل کرنا ہے، باقی تمام مراحل سے

گذر چکا ہوں۔"

"کیا آپ شروع سے پائلٹ بننا چاہتے تھے؟"

خلاف توقع علی میں حسِ مذاح پھڑکی۔ وہ ہنسا۔

"جی نہیں، مجھے بچپن سے پائلٹ نہ بننے کا شوق تھا۔"

"تو پھر__؟" زہرا کی ساتھی نے تجسس سے پوچھا۔

"بس حادثاتی طور پر ائیر فورس اکیڈمی میں آ پہنچا۔"

"ارے بھئی! کیا حادثہ ہوا تھا جس کے نتیجے میں یہاں آ دھمکے؟" زہرا نے چیونگم چباتے ہوئے اپنی عینک کے سیاہ شیشوں میں سے اُسے گھورا۔

"دراصل میں نے شروع میں بری فوج میں بھرتی ہونے کے لیے امتحان دیا تھا، لیکن اسلامیات جو لازمی مضمون تھا، اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔"

"ہاؤ سیڈ۔" زہرا نے تمسخر کے انداز میں ہمدردی کی۔

"پھر اسلامیات کی اچھی طرح تیاری کی اور ائیر فورس کے لیے درخواست دی۔ یہاں کسی نہ کسی طرح کامیاب ہو گیا۔"

"کسی __ نہ کسی طرح۔" زہرا نے ہر لفظ کو چباتے ہوئے علی کی نقل اتاری۔

"ویسے ہے یہ بڑی مشکوک بات۔" زہرا کی ساتھی لڑکی نے آگے جھک کر علی کے چہرے کو بغور دیکھتے ہوئے ہنس کر کہا۔

علی کو خفت سی محسوس ہوئی کہ زہرا اور اس کی ساتھی نے اس کے کہے ہوئے لفظوں کو پکڑ لیا ہے۔

"علی! سنا ہے کہ کیڈٹس کے ساتھ بہت سختی کی جاتی ہے۔" زہرا نے پوچھا۔

علی نے مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی۔ وہ اپنے ادارے اور برادری کے بارے میں کوئی بیان یا رائے نہیں دینا چاہتا تھا۔

لیکن زہرا نے اس کی خاموشی توڑنے کی کوشش جاری رکھی۔

"سنا ہے آپ لوگوں کو سخت سردی کے دنوں میں صبح تین چار بجے جگانے کے لیے برفیلے پانی کی بالٹیاں آپ کے سروں پر انڈیلی جاتی ہیں۔"

علی نے جواب دینے کے بجائے مسکرانے پر اکتفا کیا۔

وہ تینوں تھوڑی دیر مختلف راستوں اور روشوں پر چلتے ہوئے ایک عمارت کے پاس سے گزرے تو اندر زور سے ساز بجنے کی آوازیں سنائی دیں۔

"اوہ! یہ کیا___؟" زہرا کی ساتھی نے چونک کر پوچھا۔

"یہ ہمارا میوزک ہال اور سٹوڈیو ہے۔ آپ مہمانوں کی تفریح کے لیے جو موسیقی کا پروگرام پیش کیا جانے والا ہے، اس کی مشق ہو رہی ہے۔"

"ونڈرفل۔" زہرا نے ادا سے ذرا اچھل کر کہا۔

"بھئی مجھے تو Vital Signs بے حد پسند ہیں۔" زہرا کی ساتھی بولی۔

"جی مجھے بھی وہ پسند ہیں۔"

علی نے شکر کیا کہ موضوع تبدیل ہوا۔

زہرا نے پوپ سنگرز کے بارے میں باتیں کرتے کرتے یکدم سیاہ چشمے کے پیچھے سے وار کیا۔ وار اس قدر اچانک تھا کہ علی بوکھلا سا گیا۔ ویسے بھی وہ کوئی تیز طرار حاضر جواب قسم کا آدمی نہیں تھا۔ ذرا کسی نے چھیڑ چھاڑ کی، اور وہ ہتھیار پھینک کر پسپا ہو گیا۔ ان حالات میں اکثر اس کی زبان لکنت زدہ ہو جاتی تھی۔

"علی! آپ لڑکیوں کی طرح نازک اور خوبصورت ہیں۔"

"جی___جی___؟" علی ہکلانے لگا۔

ایک شوخ و شنگ قہقہہ فضا میں بلند ہوا اور سخت بھاری پتھر کی طرح علی کے شرمیلے وجود پر آن گرا۔

"ویسے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آج کل ماچو قسم کے کڑیل جوانوں کے بجائے Pretty boys کا رواج ہے۔"

ابھی علی اس تیکھے وار سے سنبھلنے بھی نہیں پایا تھا کہ زہرا نے آخری مہلک حملہ کر دیا۔

"میں نے سنا ہے___ شاید غلط ہو، لیکن مجھے کسی نے بتایا ہے کہ آپ لڑکوں میں بہت مقبول ہیں، بہ نسبت لڑکیوں کے۔ کہیں آپ وہ___ تو نہیں؟"

علی اس جملے کے اندر چھپے مفہوم سے لرزہ براندام ہو گیا۔ زمین نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ لائبریری کی عمارت تک وہ پہنچ چکے تھے۔ زہرا اور اس کی ساتھی خباثت سے ہنستے ہوئے عمارت کے اندر غائب ہو چکی تھیں۔ لیکن علی جہاں تھا، وہیں ساکت کھڑا تھا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے آسمانی بجلی چمکی، کڑک کر اس پر گری___ اور اسے بھسم کر دیا۔

سالانہ تقریری مقابلے ختم ہو چکے تھے اور ان میں شرکت کرنے والی طالبات اور طلباء واپس جا چکے تھے۔

سب لڑکے کیڈٹ عدنان کے کمرے میں جمع تھے۔ کیڈٹ عدنان اکیڈمی میں "ڈان جوآن" (Don Juan) کے نام سے پہچانا جاتا تھا۔ وہ قدرے نکلتے ہوئے قد اور سانولے رنگ کا عام سے نقوش والا نوجوان تھا، مگر اس کی آنکھوں کی بے نیاز خوابناکی میں کوئی ایسی کشش تھی کہ لڑکیاں اس پر فریفتہ ہو جاتی تھیں۔ اس کی ادائیں انہیں وارفتہ کر دیتی تھیں۔ وہ جب اپنے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے دھیرے دھیرے مسکراتا تو لڑکیاں بے اختیار دل ہار دیتی تھیں۔

عدنان ایک عظیم فاتح تھا، جو خود ابھی تک ناقابل تسخیر تھا۔ اگرچہ اس کی اپنی فتوحات لاتعداد تھیں۔ اسے اپنی مداحوں کے اتنے خط موصول ہوتے اور وہ جواب میں

اتنے ہی خط پوسٹ کرتا کہ لڑکوں نے اس کے کمرے کو ڈاکخانہ قرار دے دیا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ وہ اپنی ہر فتح کی خوشی میں دوسرے لڑکوں کو شریک کرنے کی کوشش کرتا۔ جب بھی کسی لڑکی کا خط آتا، وہ لڑکوں کو اپنے کمرے میں جمع کرتا اور انہیں با آواز بلند خط پڑھ کر سناتا۔ وہ ان فاتحین کی مانند تھا، جو نہ صرف مفتوحین کا سرتن سے جدا کر دیتے تھے، بلکہ دنوں تک ان کے کٹے ہوئے سروں کی برسرِ عام نمائش سے یک گونہ مسرت اور اپنی انا کی تسکین حاصل کرتے تھے۔

اس وقت عدنان پلنگ پر کسی مہا گرو کی طرح بیٹھا تھا اور باقی لڑکے اس کے گرد چیلوں کی طرح کھڑے تھے۔ اسے مختلف لڑکے سالانہ تقریری مقابلے کے موقع پر اکیڈمی آنے والی طالبات کے ساتھ اپنے معرکوں کی سرگذشت سنا رہے تھے۔ ان کے قصے کہانیاں سننے کے بعد عدنان نے اپنی بیڈ سائیڈ ٹیبل سے ایک گلابی رنگ کا معطر خط نکالا جسے وہ با آواز بلند پڑھ کر سنانے لگا۔ باقی لڑکے ہمہ تن گوش تھے۔ ان میں سے بعضوں کے چہرے پر شرارت تھی۔ بعضوں کے چہرے پر رشک اور حسرت کے ملے جلے تاثرات تھے۔ ہر سطر پڑھنے کے بعد عدنان چاروں طرف کھڑے لڑکوں کی طرف دیکھتا اور داد وصول کرتا۔ کبھی کبھی "مقرر ___ مقرر ___ ارشاد" کی صدائیں بھی بلند ہوتیں جیسے اس نے کوئی بڑے معرکے کا شعر کہہ دیا ہو۔

عدنان نے خط کے اختتام پر فاتحانہ انداز میں چاروں طرف دیکھا اور پھر پاس بیٹھے کیڈٹ سمیع کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"کیسا ہے ___؟" اس نے کہا۔

سمیع نے اپنا ہاتھ اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ پر زور سے مارتے ہوئے کہا۔ "یار! خوب، بہت خوب ___ لاجواب ___ واقعی تمہارا کوئی مقابلہ نہیں ___"

"میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔" اس نے لڑکیوں جیسی باریک آواز میں خط

کی آخری سطر دوہرائی۔

اس دوران علی دبے پاؤں چلتا ہوا کمرے کے کھلے دروازے کے سامنے سے گزرا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ عدنان اور اس کے دوستوں کی توجہ اس کی طرف مبذول ہو، لیکن عدنان دروازے کے بالمقابل بیٹھا تھا۔ سمیع سے داد وصول کرنے کے بعد اس کی نظر اچانک علی پر پڑی، جو اس لمحے دروازے کے سامنے سے گزر رہا تھا۔

"آؤ، آؤ علی!" عدنان نے علی کو پکارا۔

علی ٹھٹک سا گیا۔ وہ اس شریر گروہ سے بچ کر نکل جانا چاہتا تھا، مگر وہ جانتا تھا کہ عدنان کی آواز پر لبیک نہ کہنا بھی ناعاقبت اندیشی تھی۔ سو علی عدنان کے پکارنے پر چار و ناچار اس کے کمرے میں آ گیا۔

"یار! تم کیوں نہیں ہمارے کلب کے ممبر بنتے۔" عدنان نے پوچھا۔

"کلب___؟" علی نے سوالیہ انداز میں کہا۔

"ہاں، بس شرط صرف یہ ہے کہ تمہیں اپنی فتوحات کی یہاں سب کے سامنے رپورٹ پیش کرنی ہوگی۔"

"فتوحات___؟ رپورٹ___؟"

علی پریشان سا ہو گیا۔

"عدنان! بیچارے علی کا آئی کیو ذرا کم ہے۔ لہٰذا کھل کر بات کرو۔" سمیع نے لقمہ دیا۔

"علی! بات یہ ہے کہ تمہاری جن لڑکیوں سے دوستی ہے، ان کے بارے میں تفصیل سے بتانا ہوگا___ اور دستاویزی ثبوت کے طور پر ان کی جانب سے موصول ہونے والے خطوط کو اس کلب کی میٹنگ میں پڑھنا ہوگا۔"

علی سراسیمہ ہو گیا۔

"لڑ۔۔۔کیا۔۔۔ں۔" وہ ہکلانے لگا۔

لڑکے ہنسنے لگے۔

"جانے بھی دو، عدنان! کس چغد سے بات کر رہے ہو۔" ایک لڑکے نے جملہ کسا۔

"لڑ۔۔۔کیا۔۔۔ں۔" سمیع علی کی نقل اتارتے ہوئے بولا۔

سمیع کیونکہ علی سے سینئر تھا، اس لئے علی خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ تجربہ کار لڑکوں کے طعنوں سے وہ اپنے آپ کو اس قدر ذلیل محسوس کر رہا تھا کہ اس کا جی چاہتا تھا کہ زمین شق ہو اور وہ اس میں سما جائے۔ اسے خطرہ تھا کہ اگر وہ کچھ دیر اور کمرے میں ٹھہرا تو مزید حملے ہوں گے، اور اس میں اب برداشت کی ہمت نہیں تھی۔ سو وہ مڑا اور عدنان کے کمرے سے باہر نکل گیا۔

پرواز کی مشق جاری تھی۔ علی اور اس کا انسٹرکٹر سکواڈرن لیڈر حبیب دریائے سوات کے ساتھ ساتھ پرواز کر رہے تھے۔ بلندی سے دریا ایک تنگ نالے کی صورت دکھائی دے رہا تھا۔ انہوں نے دریا کے پار پرواز کی اور افغان خیمہ بستی پر منڈلانے لگے۔ نوشہرہ کے مکان فضا سے مٹی کے گھروندے جیسے نظر آ رہے تھے۔

سکواڈرن لیڈر حبیب کے چہرے پر خشونت کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ علی کا دل ڈوب رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں صحیح کام نہیں کر رہے تھے۔ کبھی سٹیئرنگ وہیل پر گرفت ڈھیلی ہو جاتی اور طیارہ بے قابو سا معلوم ہوتا۔ کبھی رفتار میں ضرورت سے زیادہ تیزی پر سرزنش ہوتی۔ سکواڈرن لیڈر حبیب نے اسے طیارہ اوپر لے جانے کو کہا اور پھر نیچے لانے کو۔ علی اس ہدایت پر عمل کرتے وقت طیارے کو قابو میں نہ رکھ سکا۔ طیارہ میزائل کی طرح چھوٹا اور تیزی سے زمین کی طرف گرنے لگا۔ سکواڈرن لیڈر حبیب نے بروقت مداخلت کی اور طیارہ

سیدھا ہو کر قابو میں آ گیا، لیکن اس واقعے کے بعد اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا۔ وہ غصے سے پھنکارنے لگا۔ اب وہ اس موڈ میں تھا کہ علی کو، اس کی انا کو، اور اس کی عزتِ نفس کو کاری ضرب لگانا چاہتا تھا۔

"مرد ہو، علی! مرد۔"

"یس سر۔" بوکھلائے ہوئے علی نے کہا۔

"لگتا ہے تم نے ابھی تک کسی عورت کو جنسی طور پر فتح نہیں کیا۔"

"یس سر۔" علی احمقوں کی طرح فوجی ضابطے کے مطابق اپنے انسٹرکٹر کی ہاں میں ہاں ملائے جا رہا تھا۔

"کیا تم نامرد ہو؟"

سکواڈرن لیڈر حبیب، علی کو کچا چبا جانے والی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ علی شرمساری سے شرابور تھا۔ کسی اور نے بھی اسے اس سے ملتی جلتی گالی دی تھی۔ اس کا سر گھومنے لگا۔ دل سینے میں زخمی پرندے کی طرح پھڑ پھڑانے لگا۔ یکدم ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا سکواڈرن لیڈر حبیب زہرا میں تبدیل ہو گیا، جو اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ اس کے چہرے پر شیطنت تھی اور ہاتھ میں بھالا۔ پھر اس کی آواز انتہائی شدت سے علی کے کانوں کے پردے سے ٹکرائی۔

"کہیں آپ وہ___ تو نہیں؟"

زہرا کا ظالم قہقہہ فضا میں بلند ہوا۔ طیارہ ڈولنے لگا۔

اچانک زہرا نے سمیع کی جون اختیار کر لی۔ "لڑ۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔ں۔" سمیع نے علی کا تمسخر اڑایا۔

"چھکا___" کہیں سے کوئی پکارا۔

سکواڈرن لیڈر حبیب کی گرج سنائی دی۔ "نامرد۔"

طیارہ قلابازیاں کھانے لگا___ ایک___ دو___ تین___ چار، علی کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ سارے جسم کا خون دماغ کی طرف سرپٹ دوڑنے لگا۔ شریانوں میں خون کی تیزی سے یہ احساس ہوتا تھا کہ وہ ابھی جلد کی جھلی سے ابل پڑے گا۔ علی کا سر کسی چیز سے ٹکرایا۔ اس کے بعد اسے نہیں معلوم کہ کیا ہوا، کس طرح سکواڈرن لیڈر حبیب نے طیارہ ائیر سٹرپ پر اتارا۔ البتہ اسے واضح طور پر یاد تھا کہ طیارے سے اترنے کے بعد سکواڈرن لیڈر حبیب نے اسے جن قہر آلود نگاہوں سے دیکھا، وہ اس بات کا ثبوت تھیں کہ اس کا کیرئیر بطور ائیر فورس پائلٹ، اختتام کو پہنچ چکا ہے۔

جب علی اپنے سبزی مائل خاکی ایویشن سوٹ میں Dorm کی طرف جا رہا تھا تو پکاسو کے بلیو پیریڈ کے اندھے گٹارسٹ کی طرح اس کے جسم کے تمام خطوط سے کرب ٹپک رہا تھا۔

۶

علی معطل ہونے کے بعد لاہور پہنچا، تو وہ بہار کے دن تھے۔ فضا پھولوں کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ ہوا میں سرمستی تھی۔ ٹریفک کے شور کے باوجود پرندوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لیکن علی اس پُر بہار شہر میں ایک ایسے سپاہی کی طرح لوٹا، جس کی تلوار ٹوٹ چکی ہو، گھوڑا نیم جاں ہو، اور ذلت اور رسوائی اس کا مقدر بن چکی ہو۔ اسے یقین تھا کہ امی پر اس کی واپسی کی خبر بم کی طرح گری تھی، مگر وہ سخت جان تھیں۔ خاموشی سے پی گئیں۔ انہوں نے بظاہر علی کو کوئی دوش نہ دیا۔ بس چپ چاپ اس کی ناکامی کی روئداد کو سنا اور معمول کے مطابق گھریلو کاموں میں الجھ گئیں۔ علی کو ایسا لگا جیسے وہ ایک بار پھر دھند میں ڈوب گئیں تھیں۔ وہ فاصلے جو حسین بھائی کے تنزل کے باعث سمٹنے لگے تھے، دوبارہ دونوں کے درمیاں صحرا کی طرح پھیلنے لگے۔

امی کے سکوت سے گھر کے کمروں میں ٹھنڈک سی پھیل گئی تھی۔ علی کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اسے برا بھلا کہیں، ڈانٹیں، صلواتیں سنائیں، کچھ کریں، اس موت جیسی خاموشی کو

توڑیں، مگر وہ تو منجمد ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس انجماد میں علی کا دل ایک بار پھر بے اختیار مس ڈینیل کو ملنا چاہ رہا تھا۔

اس نے فون کیا تو مس ڈینیل نے حسب معمول تپاک سے اس کا خیر مقدم کیا۔ اس نے کہا کہ وہ آج شام انہیں ملنا چاہتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ شام کو فارغ ہیں، اگر وہ آنا چاہتا ہے تو آ جائے۔

علی شام کے قریب مس ڈینیل سے ملاقات کی غرض سے نکلا تو اس نے ان کے ہاں جانے سے پہلے پھولوں کی دوکان سے ان کے لیے نرگس کے پھول خریدے۔ علی مس ڈینیل کی کوٹھی پہنچا اور دروازے پر لگی گھنٹی بجائی۔ مس ڈینیل خود اس کے سواگت کے لیے باہر برآمدے میں چلی آئیں۔

"ہیلو ___ کیسے ہو؟"

علی نے رسمی سا جواب دینے کے بعد برآمدے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انہیں نرگس کے پھول تھما دیئے۔

"یہ ___ آ ___ پ ___ کے ___ لیے ___ ہیں۔"

پھول پکڑاتے ہوئے وہ لڑکھڑا سا گیا۔ مس ڈینیل نے فوراً اسے سہارا دیا۔ انہوں نے دیکھا کہ علی قدرے سکڑ گیا تھا۔ اپنی ذات کے بارے میں اس کا اعتماد متزلزل تھا۔ زبان میں لکنت اور پاؤں میں لڑکھڑاہٹ تھی۔ جب اس کے قدم سیڑھیوں پر ڈگمگائے اور مس ڈینیل نے اسے سنبھالا تو وہ پہلے سے بھی زیادہ شرمندہ ہو گیا۔

جب مس ڈینیل اور علی ڈرائنگ روم میں بیٹھ گئے تو مس ڈینیل نے ایک ہی سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔

"کب آئے ہو اور کیسے؟ کتنی چھٹیاں ہیں؟ کچھ پریشان سے لگ رہے ہو؟ کیا بات ہے؟"

"مجھے یہاں آئے ہوئے دس بارہ روز ہوئے ہیں۔"

پھر علی نے قدرے تامل سے اس اندرونی اذیت اور شرمساری کے باوجود جو اسے محسوس ہو رہی تھی، بڑی دیانت داری، لیکن کسی قدر تلخی سے کہا۔ "مس! میں ہمیشہ کے لیے لاہور آ گیا ہوں۔"

"کیوں؟" مس ڈینیل نے چونک کر پوچھا۔

"مجھے ایئرفورس نے معطل کر دیا ہے۔ مجھ میں پائلٹ بننے کی اہلیت نہیں ہے۔"

مس ڈینیل سکتے میں آ گئیں۔ انہوں نے علی کی آنکھ میں تیرتے آنسو دیکھے۔ پھر انہوں نے میز پر رکھے علی کے دیئے ہوئے نرگس کے پھولوں کو دیکھا۔ نرگس کی آنکھوں میں حسرت جمی تھی۔ اب انہیں سمجھ آئی کہ علی نرگس کے پھول کیوں لایا ہے۔ نرگس انتظار، حسرت اور ہجر کی علامت ہی تو ہے۔

خاموشی نے کمرے کو گھیر لیا۔ مس ڈینیل افسردہ تھیں۔ انہیں پتہ نہیں چل رہا تھا کہ وہ علی سے کیا کہیں۔ اکثر ایسے آدمی کی زبان بند کر دیتے ہیں۔ ان المیوں کی گہرائی اور گیرائی کے مقابل الفاظ چھوٹے ___ بہت چھوٹے اور معمولی محسوس ہوتے ہیں۔

علی نظریں جھکائے، آنسو پینے کی کوشش میں نیچے فرش پر بچھے قالین کے پیچیدہ نقش و نگار کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ مس ڈینیل کو یہ خاموشی جو ان دونوں پر چھا چکی تھی، تکلیف دہ معلوم ہو رہی تھی۔ انہیں جانے کیوں شرمندگی سی محسوس ہو رہی تھی۔ جیسے یہ سب کچھ ان کا کیا دھرا ہو۔

جب ان کے لیے یہ خاموشی مزید برداشت کرنی ممکن نہ رہی، تو وہ گلا صاف کرتے ہوئے بولیں۔

"یہ بڑا افسوسناک واقعہ ہے، مگر مجھے امید ہے کہ تم سنبھل جاؤ گے۔"

"شاید ___" علی نے نظریں قالین سے اٹھا کر ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگراس وقت تو یوں لگتا ہے کہ زخم جان لیوا ہے۔ میں اپنے آپ کو بہت ہی ذلیل محسوس کر رہا ہوں۔ میں اپنی ہی نظروں میں گر چکا ہوں۔"

"نہیں نہیں، ایسا مت سوچو۔ آخر ائیر فورس کا کیریئر ہی تو دنیا کا پہلا اور آخری پیشہ نہیں، اور بھی بہت سے راستے موجود ہیں۔"

"آپ شاید نہیں جانتیں جسے معطل کر دیا جاتا ہے وہ اکیڈمی کے حلقے میں رسوا ہو جاتا ہے۔ جو فضاؤں کو مسخر نہیں کر سکتا، اسے زمین پر بھی پاؤں دھرنے کی جگہ نہیں مل سکتی۔"

"خدا کے لیے، علی! بند کرو یہ مایوسی کی باتیں۔ اکیڈمی سے باہر ایک وسیع دنیا ہے۔ بے شمار لوگ جس میں بستے ہیں۔ ان کی بھی عزت ہے۔ وہ بھی اپنے اپنے میدان میں کامیابی حاصل کرتے ہیں___ اور خوش بھی ہیں۔"

"مگر___ میں اب کبھی افسر نہیں بن سکوں گا۔ بس ایک عام شہری بن جاؤں گا۔ مجھ جیسے تو ہزاروں اس شہر کی گلیوں میں رلتے پھرتے ہیں۔" علی نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

یہ علی کی متوسط، متوسط درجے کی نفسیات بول رہی تھی۔ اس نے کبھی غربت کو عریاں نہیں دیکھا تھا، لیکن سفید پوشی کی بے بسی سے خوب آشنا تھا۔ اسے اور اس کے خاندان کے کسی فرد کو معاشرت میں اہمیت، توقیر، اقتدار اور رسوخ حاصل نہ ہو سکا تھا۔ سو ان چیزوں کی اسے تمنا بھی تھی اور خواہش بھی۔ فوج کے لیے عموماً اور فضائیہ کے لیے خصوصاً پاکستانیوں کے دلوں میں جو ہیرو ورشپ موجود تھی، اس کی بناء پر وہ توقع رکھتا تھا کہ بالواسطہ طور پر وہی تحسین، وہی ستائش اسے بھی حاصل ہو جائے گی۔ فضائیہ کے شاہینوں کی چمک سے کسے انکار ہو سکتا تھا۔

"دیکھو علی! تمہارا زخم کاری بھی ہے اور تازہ ہونے کے سبب ہرا بھی۔ مگر میں اپنے تجربے کی بناء پر کہتی ہوں کہ ہر زہر کا تریاق، ہر زخم کا مرہم اور ہر غم کا مداوا وقت ہے، بس

کے بہاؤ میں خس و خاشاک بھی بہہ جاتے ہیں اور سنگلاخ چٹانیں بھی۔ زخم ہمیشہ ہرے نہیں رہتے ___ صدمے کا بھالا سدا دل میں کھبا نہیں رہتا۔ انسان بڑا ڈھیٹ واقع ہوا ہے۔"

علی نے مس ڈینیل کی جانب دیکھا اور دو آنسو اس کے رخساروں سے گر کر قالین میں جذب ہو گئے۔

"جی ___ فادر جارج آئے ہیں۔" کرخت آواز والے ملازم نے مس ڈینیل کو بتایا۔

"انہیں ڈرائینگ روم میں لے آؤ۔" مس ڈینیل نے کہا۔

"اچھا مس! میں اب چلتا ہوں۔" علی فوراً صوفے سے اٹھتے ہوئے بولا۔

مس ڈینیل کو تعجب ہوا۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ علی حسب معمول رات کا کھانا کھا کر جائے گا۔

"بھئی، بیٹھو۔ ایسی بھی کیا جلدی ہے؟"

"نہیں جی، بس مجھے اجازت دیں۔"

"شاید تم فادر جارج کی وجہ سے جانا چاہتے ہو۔"

"نہیں، ایسا تو نہیں ہے۔"

"تو پھر ___؟"

"بس یونہی، کسی کام سے جانا ہے مجھے۔"

" کھانا تو کھا لیتے۔"

"پھر کبھی سہی۔"

"اچھا۔"

مس ڈینیل جان گئی تھیں کہ اس وقت اصرار بے سود ثابت ہوگا۔ وہ صوفے سے اٹھیں کہ علی کو باہر تک چھوڑ آئیں۔ لیکن علی نے انہیں منع کر دیا۔ فادر جارج کے ڈرائنگ روم

میں داخل ہونے سے پہلے ہی علی رخصت ہو گیا۔

گھر میں سناٹا سا تھا۔ امی محلے میں کسی کے گھر گئی ہوئی تھیں۔ علی اپنے پالتو کتے پی چُو کو ڈھونڈ رہا تھا۔ باقی کمروں میں اسے تلاش کرنے کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں گیا تو پی چُو کو نہایت شان سے بڑے صوفے پر براجمان پایا۔ اس نے ہلکی سی ناراضگی کا اظہار کیا، جس کا پی چُو پر مطلق اثر نہ ہوا۔ اسے پی چُو بڑا پیارا لگتا تھا۔ پی چُو روسی نسل کا لمبے بالوں والا سفید کتا تھا۔ علی ہی کی طرح مہذب اور نرم خُو۔

علی نے پی چُو کو گود میں اٹھا لیا اور اس کے لمبے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔ پی چُو پیار کے خمار میں ناز سے مست بیٹھا تھا۔ علی یہ سوچ رہا تھا کہ پی چُو کچھ دنوں سے بدل سا گیا ہے۔ پہلے علی گھر میں داخل ہوتا تو پی چُو دوڑ کر اس کا استقبال کرتا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا۔ علی کے پکارنے پر فوراً دوڑا دوڑا آتا۔ اس کے بستر پر اپنا حق سمجھ کر پاؤں پسار کر سوتا، مگر ادھر کچھ دنوں سے اس کے تیور بدلے بدلے سے تھے۔ نہ وہ خیر مقدم، نہ اگلا سا التفات اور گرمجوشی۔ اب پی چُو نے علی کے بستر پر ڈیرہ جمانے کے بجائے ڈرائنگ روم کے بڑے صوفے کو اپنے لیے چن لیا تھا۔ ویسے بھی وہ لیے دیے رہتا تھا۔ علی کے پچکارنے پر گردن اٹھا کر اسے بے نیازی سے دیکھتا رہتا تھا، جیسے اسے علی سے کوئی خاص دلچسپی نہ ہو۔

" لگتا ہے اسے بھی میری ذلت و رسوائی کا پتہ چل گیا ہے۔ شاید اسی لیے آنکھیں پھیر لی ہیں۔"

علی ان سوچوں میں گم تھا۔ نیچے مالک مکان کے گھر کیسٹ پلیئر بج رہا تھا۔

"دکھ کے دن بیتت نہ۔"

"سہگل کا مشہور زمانہ گانا ... مالک مکان کا ذوق اچھا ہے"

"دکھ کے دن بیتت نہ۔"

"ٹھیک ہی تو کہہ رہا ہے سہگل۔ دکھ کے دن واقعی کتنے لمبے ہوتے ہیں کہ کاٹے نہیں کٹتے۔" علی نے افسردگی سے سوچا۔

اسے آج کل سمجھ نہیں آتی تھی کہ وقت کیسے گزارے۔ ایئر فورس اکیڈمی کی جانب سے اسے خط موصول ہو چکا تھا، جس میں اسے زمین پر کسی اسامی کی پیشکش کی گئی تھی۔ لیکن علی کی مجروح انا نے اسے مجبور کر دیا تھا کہ وہ اس پیشکش کو قبول نہ کرے۔ ویسے بھی فضائیہ میں زمین پر کام کرنے والوں کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی۔ ان اسامیوں کو دوسرے اور بعض دفعہ تیسرے درجے کی سمجھا جاتا ہے۔ علی بھلا یہ کیسے گوارا کرتا کہ وہ اپنے ہی ساتھیوں کے مقابلے میں کم حیثیت میں کام کرے۔ کسی اور کیریئر کی اسے اب تک نہیں سوجھی تھی۔ سو وہ فارغ تھا ــــ مکمل طور پر۔ اس کے پاس وقت تھا ــــ بے اندازہ وقت۔ بلکہ وقت ایک کوہِ گراں تھا، جو اس کے کندھوں پر سوار تھا، اور جسے کاٹنے کے لیے اس کے پاس کوئی تیشہ، کوئی حیلہ، کوئی بہانہ نہیں تھا۔

فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ علی نے فون کا ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو۔" وہ بولا۔

"ہیلو۔" ایک زنانہ آواز آئی۔

"کون بول رہا ہے؟"

"جی، میں علی بول رہا ہوں۔ آپ کون؟"

"میں نرگس بول رہی ہوں۔"

تھوڑے سے وقفے سے پھر خاتون نے کہا۔ "پہچانا آپ نے؟"

"جی ــــ جی نہیں۔"

"اس دن سراج صاحب کے ہاں آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"اچھا، اچھا، اب یاد آیا۔"

"میں نے سراج صاحب ہی سے آپ کا فون نمبر معلوم کیا ہے۔"

"اچھا۔"

"آپ کسی دن میرے ہاں آئیں۔"

"جی___؟"

علی کو تعجب ہوا، کیوں کہ وہ کسی اجنبی خاتون سے ایسی بے تکلفی کی توقع نہ رکھتا تھا۔

"یہ رسمی دعوت نہیں۔ سچ مچ آپ کو Invite کر رہی ہوں۔"

"جی ضرور۔ وہ ایسا ہے کہ میرے ایک دوست آئے ہوئے ہیں۔ اس لیے اب اجازت چاہتا ہوں۔" علی نے جان چھڑانے کے لیے بہانہ تراشا۔

"اچھا، چلئے اس وقت تو آپ کو معاف کیا، مگر آئندہ گپ ہونی چاہیے۔"

علی نے جواب میں خاموشی اختیار کر لی اور نرگس نے اسے خاموش نیم رضا پر محمول کر کے فون بند کر دیا۔

علی اپنے اور حسین بھائی کے مشترکہ کمرے میں بیٹھا تھا کہ حسین بھائی داخل ہوئے۔ وہ صبح سے کہیں غائب تھے۔ آج کل علی اپنے اندر اتنا گم تھا کہ گذشتہ کئی دنوں سے ان کی طرف متوجہ نہیں تھا، لیکن اس وقت ان کی بدلی ہوئی ہیئت نے فوراً اس کی توجہ کو کھینچا۔ خلاف توقع حسین بھائی کے ہاتھ میں مذہبی کتب موجود نہ تھیں اور خلاف معمول ان کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ آنکھوں میں بھی زندگی کی چمک تھی۔ دونوں نے علیک سلیک کی۔ حسین بھائی غسل خانے چلے گئے۔ علی اٹھ کر ڈرائنگ روم میں آ بیٹھا اور ٹی۔ وی آن کر دیا، جو ٹی۔ وی لاؤنج نہ ہونے کے سبب ڈرائنگ روم میں رکھا تھا۔ اس کی نظریں ٹی۔ وی سکرین پر جمی

ہوئی تھیں، لیکن دھیان کہیں اور تھا۔

حسین بھائی ڈرائنگ روم میں آئے اور علی کے قریب صوفے پر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر میں اٹھ کر کھانے والے کمرے میں چلے گئے، دو تین منٹ بعد دوبارہ ڈرائنگ روم میں وارد ہوئے اور علی کو دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگے۔

"کیا ہوا؟ ___ کس بات پر ہنس رہے ہیں؟" علی نے حیرت سے پوچھا۔

"کچھ نہیں، یونہی ہنسی آ رہی ہے۔"

"یونہی ہنسی آ رہی ہے ___ آخر کیوں؟" علی نے کسی حد تک ناگواری سے سوال کیا۔

"بس یونہی ___ کوئی وجہ نہیں۔"

علی سوچ میں پڑ گیا۔ اسے احساس ہو گیا تھا کہ کوئی راز حسین بھائی کے اندر کا بلا رہا ہے ___ کوئی بات ان کو اندر ہی اندر سے گدگدا رہی ہے، مگر وہ مدتوں سے جزیرے کی صورت دوسروں سے اتنے کٹ چکے تھے کہ ان کے لیے دوری کے ان پانیوں پر جو برسوں پر محیط تھے، پل بنانا، فوری رابطہ قائم کرنا یا بے تکلفانہ دل کی بات کہنا غیر فطری سا بن چکا تھا۔

علی نے بھی ضبط کا دامن تھام رکھا تھا، وہ بے دھڑک ان کی ذات کے خلوت میں داخل نہ ہونا چاہتا تھا۔ سو وہ صبر کر رہا تھا کہ کسی لمحے جو حسین بھائی کی اپنی ذات کے ردھم کے لحاظ سے مناسب ہوگا، وہ خود ہی اپنا راز اگل دیں گے اور یہ اخفا بھی تو اظہار ہی کا ایک طریقہ تھا۔

اگلے دن علی کی آنکھ صبح سویرے کھل گئی۔ امی ابھی سو رہی تھیں۔ علی نے انہیں جگانا مناسب نہ سمجھا اور خود ہی ناشتہ تیار کر لیا۔ ناشتے کے دوران وہ اخبار بھی پڑھتا رہا۔ ابھی

علی ناشتہ کر رہا تھا کہ حسین بھائی کھانے والے کمرے میں آئے اور خاموشی سے علی کے بالمقابل بیٹھ گئے۔علی بدستور اخبار کی طرف متوجہ رہا۔حسین بھائی نے گلا صاف کیا،تھرمس میں سے چائے پیالی میں انڈیلی اور چسکیاں لے کر پینے لگے،لیکن وہ بار بار دزدیدہ نگاہوں سے علی کی طرف دیکھتے جا رہے تھے،جیسے اس سے کچھ کہنا چاہ رہے ہوں۔اگر چہ علی اخبار کی اوٹ میں تھا،مگر بنا دیکھے ہی اسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کچھ کہنے کے لیے پر تول رہے ہیں___ ذہنی طور پر تیار ہو رہے ہیں۔

آخر علی سے نہ رہا گیا اور وہ اخبار کے صفحوں کو سمیٹتے ہوئے بولا۔

"کیا بات ہے،حسین بھائی؟"

"وہ___ دراصل میں تمہیں بتانا چاہ رہا ہوں کہ میں بی ایس سی کے امتحان کی دوبارہ تیاری شروع کرنا چاہتا ہوں۔"

"سچ!یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔"

علی ششدر تھا کہ اتنا عظیم انقلاب غیر متوقع طور پر یکدم حسین بھائی میں کیسے رونما ہو گیا۔اگر چہ اسے سچی خوشی ہوئی تھی کہ حسین بھائی نے ایک مرتبہ پھر دنیا اور اس کے معاملات کی طرف رخ موڑا تھا،لیکن ابھی اسے پورا یقین نہ تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔سو وہ بے اعتباری سے حسین بھائی کا جائزہ لے رہا تھا کہ آیا جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں،اس کے بارے میں وہ سنجیدہ بھی ہیں یا نہیں۔

تھوڑی دیر حسین بھائی اپنے آپ میں مست بیٹھے رہے۔پھر علی سے مخاطب ہوئے۔

"وہ رجو خالہ ہیں نا۔"

"رجو خالہ___؟"

"وہ جو امی کی سہیلی [illegible]"

علی حیران تھا کہ یہ بھی کوئی رشتہ ہے، مگر پھر بھی وہ اس خاتون کو خالہ کہنے پر مجبور تھے۔

"اچھا؟"

"ان سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"کب؟"

"دو مہینے پہلے ___ ابھی تم اکیڈمی میں تھے۔"

"تو پھر ___؟"

حسین بھائی جھینپ سے گئے، اور اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ البتہ علی کو یہ سوچتا چھوڑ گئے کہ آخر حسین بھائی کیا پہیلیاں بجھوا رہے تھے۔ حسین بھائی کو تو عزیزوں سے ملنا جلنا پسند نہیں تھا۔ پھر رجو خالہ سے ملاقات کا تذکرہ کیوں؟ حسین بھائی نے عام امنگوں اور جذبوں کو آنکھ بھر کر دیکھنے سے پہلے ہی ترک کر کے لوہے کے مضبوط صندوق میں مقفل کر گودام میں رکھ دیا تھا، تا آنکہ اس صندوق پر گرد جم گئی اور قفل میں زنگ لگ گیا۔ اب جانے وہ کون سا اسم اعظم ہے جس کے سحر سے صندوق کا زنگ آلود قفل کھلنے لگا ہے، لیکن علی نے ان کی تبدیلی کا راز معلوم کرنے کے لیے کسی قسم کا دباؤ ڈالنا مناسب نہ سمجھا۔ بس وہ دم سادھے، سانس روکے منتظر رہا کہ کہیں حسین بھائی کے اندر کا آبگینے کی مانند نازک تغیر کسی جلد بازی یا زبردستی کے باعث مجروح نہ ہو جائے۔

کچھ دن پُراسرار حرکتوں اور معنی خیز باتوں کے بعد آخر حسین بھائی نے وہ راز اُگل دیا، جو ان کے اندر مچل رہا تھا۔ وہ اور علی باغ میں سیر کے لیے گئے ہوئے تھے۔ وہ دونوں باغ کے درمیان میں بنی ہوئی ایک پہاڑی پر چڑھنے لگے، جس پر سبزے نے ڈھلوانوں کو چھپا رکھا تھا اور یوکلپٹس کے درخت سر اٹھائے کھڑے تھے۔ دونوں بھائی چوٹی پر پہنچنے کے بعد ہانپ رہے تھے، سو ایک لکڑی کی بنچ پر بیٹھ گئے۔ وہاں بنچ پر بیٹھے بیٹھے حسین

بھائی نے اچانک وہ خبر علی کو سنا ڈالی، جو اتنے دنوں سے انہیں پُراسرار بنائے ہوئے تھی۔

"علی! مجھے محبت ہوگئی ہے۔" انہوں نے علی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔

علی کو برقی جھٹکا سا لگا۔

"کس سے؟" علی نے بے ساختہ پوچھا۔

"رجو خالہ کی بیٹی ___ تسنیم سے۔"

علی نے ان کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر سورج روشن تھا۔ یوکلپٹس کے درخت نیچے جھک آئے اور لکڑی کی بینچ فضا میں بلند ہوگئی۔ علی نے کسی انجانے جذبے سے حسین بھائی کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

جب رات کو دونوں بھائی گھر لوٹے تو وہ کسی اندرونی مسرت سے دمک رہے تھے۔

۷

علی کھانے والے کمرے میں گول میز پر کاغذات اور کتابیں پھیلائے کمپیوٹر سائنس کی گتھیاں سلجھا رہا تھا۔ اس نے کمپیوٹر کورس میں داخلہ لے لیا تھا تا کہ فکرِ معاش کا کوئی حل نکالا جا سکے۔ اسے کمپیوٹر کی تکنیک پر مہارت حاصل کرنے میں کافی وقت پیش آ رہی تھی۔ دراصل وہ کوئی زیادہ ذہین شخص نہیں تھا۔ بس نارمل اور غبی کے درمیانہ حاشیہ پر تھا۔ ہر امتحان میں وہ وقت ہی سے کامیاب ہوتا رہا تھا۔ اس وقت بھی اس کے عموماً شگفتہ چہرے پر تردد کے آثار نمایاں تھے اور پیشانی پر ذہنی کوشش کے سبب بل پڑے تھے۔ اس پر قیامت یہ کہ فون کی گھنٹی متواتر بجے چلی جا رہی تھی۔ وہ ریسیور اٹھانا نہیں چاہتا تھا، مگر کوئی شخص ڈھٹائی کی استقامت سے بار بار فون کرنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

آخر علی نے اس شخص کے عزمِ صمیم کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس نے فون کا ریسیور اٹھایا اور کان سے لگا کر بیزاری سے بولا۔

"ہیلو۔"

جواب میں "ہیلو" کے ساتھ ہنسی کی جھنکار سنائی دی۔

"علی ہیں؟"

"جی، میں علی ہی بول رہا ہوں۔"

"اوہ! سوری، میں نے آپ کی آواز پہچانی نہیں۔"

"یہ تو فرمایئے کہ آپ ذات شریف ہیں کون؟"

"میں؟___ میں نرگس بول رہی ہوں۔"

"نرگس___؟"

کچھ دیر کے لیے علی کے ابر آلود ذہن کو اس نام کی مالکہ کو شناخت کرنے میں دقت محسوس ہوئی۔

"نرگس___ نرگس۔ آپ کہیں وہ تو نہیں جنہوں نے چند روز پہلے بھی فون کیا تھا؟"

"جی، بالکل وہی۔ آپ کی نیاز مند۔"

اس جملے کے ساتھ ہی ایک جھنجھناتا ہوا قہقہہ بلند ہوا۔

حسب معمول علی چھیڑ خانی سے جھینپ سا گیا۔ وہ عموماً ایسے موقعوں پر حاضر جوابی کا مظاہرہ کرنے کے بجائے غیر حاضر دماغ ہو جاتا تھا۔ خوش قسمتی سے چھیڑ چھاڑ کے سلسلے نے زیادہ طول نہیں کھینچا۔ کیوں کہ نرگس نے جلد ہی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے اسے اپنے ہاں آنے کی دعوت کا اعادہ کیا۔

کچھ دیر علی سوچتا رہا۔ پھر سوچا کہ کیا حرج ہے، شاید اسی بہانے وہ اپنے ذہنی تناؤ سے چھٹکارا حاصل کرے۔ سو مشروط سی حامی بھر لی۔

دو دن بعد علی نرگس کے بتائے ہوئے پتے پر گلبرگ مین مارکیٹ کے پیچھے واقع

ایک عمارت میں پہنچ گیا، جہاں وہ رہتی تھی۔ اس کا فلیٹ تیسری منزل پر تھا۔

نرگس نے بڑی گرم جوشی سے علی کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا۔ "شکر ہے، علی! آپ ہمارے گھر تو آئے۔"

"جی۔" علی بغیر کسی واضح جذبے کے بولا۔

"آپ کے ساتھ اور کون کون یہاں رہتا ہے؟"

"بس میں اور میری بیٹی۔"

لمحہ بھر کو علی ٹھٹک گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ نرگس شادی شدہ ہے۔ اس اس نے غور کیا، تو شادی شدہ ہونے کی چھاپ اس کے جسم پر نمایاں تھی۔ وہ فربہ نہیں تھی، لیکن جسم لڑکیوں کی طرح دبلا بھی نہ تھا، بھرا بھرا سا تھا۔ آنکھوں میں بھی چشیدگی کے اثرات تھے۔

تھوڑی دیر کے لیے علی کو اپنے اوپر بے حد غصہ آیا۔ بغیر سمجھے بوجھے، جانے پہچانے وہ ایک اجنبی عورت کی دعوت پر اس کے گھر چلا آیا۔ یہ اس کی غیر حاضر دماغی تھی کہ اس نے اس ملاقات کے مضمرات پر غور نہیں کیا تھا۔ اس نے اسے محض تفریح سمجھا تھا۔

"آپ کے میاں کہاں ہیں؟"

علی نے واپس حال کی طرف آتے ہوئے پوچھا۔

"وہ ___" نرگس نے معنی خیز نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہ تو متحدہ عرب امارات میں ہوتے ہیں۔ انجینئر ہیں۔"

"آپ ان کے ساتھ کیوں نہیں رہتیں؟"

"دراصل ___" نرگس کے چہرے پر بادل سا چھا گیا۔ پھر اس نے جرأت کا ثبوت دیتے ہوئے کہہ دیا۔ "وہ اور میں علیحدہ ہو چکے ہیں۔"

"کیا طلاق ہو گئی ہے؟"

"نہیں ___ نہیں تو۔ لیکن ہم نے دو مہذب افراد کی طرح طے کرلیا ہے کہ اپنے اپنے راستوں پر گامزن رہیں گے، اور ایک دوسرے کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کریں گے۔"

"تو اس کا عملی نتیجہ بھی تو وہی ہوا، جو طلاق کا ہوتا ہے۔"

"نہیں تو۔ ہم نے اپنی بیٹی کے لیے شادی کا بھرم قائم رکھنے کا ارادہ کیا ہے تاکہ اسے کسی قسم کا ذہنی دھچکا نہ لگے، جو والدین کی طلاق کی صورت میں بچے کا مقدر ہوتا ہے۔"

نرگس نے قدرے اداسی سے بات جاری رکھی۔ "ویسے میرے شوہر بڑے فیاض ہیں۔ کھلے دل سے وظیفہ بھیجتے ہیں۔"

علی بھی آزردہ سا ہو گیا۔ اسے اپنے ابو یاد آ گئے، جو امریکہ ایسے سدھارے کہ لوٹ کر نہ آئے۔ امی، حسین بھائی اور اسے یکسر فراموش کر کے وہیں شادی رچالی۔ نرگس کا شوہر تو انسانیت کا مظاہرہ کر رہا تھا کہ علیحدگی کے مشترکہ فیصلے کے باوجود ماہانہ خرچ کھلے دل سے دے رہا تھا ___ لیکن اس کے ابو نے تو امی پر علیحدگی زبردستی مسلط کی تھی ___ مارشل لاء کے کسی آرڈیننس کی طرح، یک طرفہ اور جبری۔ اس کے باوجود انہوں نے انہیں نان نفقہ کا تقریباً محتاج کر دیا تھا۔ یہ تو امی نے کچھ پس انداز کی ہوئی رقم سے سرکاری سکیموں میں سرمایہ کاری کر رکھی تھی ورنہ ان کی سفید پوشی کا بھرم بھی ختم ہو جاتا۔ کبھی کبھار ابو کی طرف سے تھوڑی بہت رقم آ جاتی تھی۔

علی نے پہلی مرتبہ نرگس کے لیے یگانگت محسوس کی کہ وہ دونوں ایک ہی کشتی کے سوار تھے۔

اس دن علی نرگس کے ہاں تھوڑی دیر رکا، گپ شپ کی اور پھر چلا آیا۔

جمعہ کی دوپہر کو نانی ذیشان ماموں کے ہمراہ فیصل آباد سے لاہور پہنچیں۔ ذیشان

ماموں نانی کے لے پالک تھے۔ یہ ستائیس برس پہلے کی بات ہے کہ ایک دن علی الصبح نانی نماز کے لیے اٹھیں تو انہیں گھر کے دروازے کے باہر کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے دروازے سے جھانکا تو کپڑے میں لپٹا ایک نوزائیدہ بچہ دکھائی دیا، جو دروازے کے قریب گلی میں پڑا تھا۔

نانی کی دو بیٹیاں تھیں، بیٹے کی تمنا تھی۔ سو اس لاوارث بچے کو گود لے لیا۔ ویسے نانی نے اپنے طور پر سراغ رسانی جاری رکھی اور اس نتیجے پر پہنچیں کہ یہ بچہ غالباً علاقے کے ایک متمول زمیندار ملک شہباز کا ہے۔ وہی صدیوں پرانی داستان تھی ___ جاگیردارانہ نظام کے استحصال، معاشرے کے جبر، مرد کی بے وفائی، عورت کی بے بسی اور ان حالات سے جنم لینے والوں کی بے کسی کی۔

بہر حال نانی نے بڑی محبت اور خلوص سے ذیشان ماموں کو پالا پوسا تھا۔ لیکن نانی خود بھی محرومیوں کی پروردہ تھیں۔ سوتیلی ماں کے ہاتھوں مجروح ___ شادی کے بعد صرف بیٹیوں کا جنم ___ بیٹے کی حسرت ___ دونوں بیٹیوں کی کم عمری کی شادیاں اور ان کی شادیوں کی ناکامیاں ___ ایک کی طلاق ___ دوسری بیٹی یعنی علی کی امی کے شوہر کی بے وفائی ___ سب نے مل کر نانی کو قنوطی بنا دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنی اور ذیشان کی محرومیوں کی داستانیں اس کی روح میں ایسی سموئیں ___ ذہن پر ایسے نقش کندہ کیے کہ ذیشان ماموں کا وجود ان گرم سلاخوں سے داغ داغ ہو گیا ___ زندگی پر سے ان کا اعتبار اٹھ گیا۔ یوں وہ اپنے اور نانی دونوں کے عذاب کے مارے ہوئے تھے۔

جب علی اس کمرے میں داخل ہوا، جہاں نانی بیٹھی تھیں تو انہوں نے اسے گلے لگا کر چٹاخ چٹاخ بوسے دیئے۔ نانی کے دو تین دانت ٹوٹے ہوئے تھے، سو جب وہ بوسہ دیتیں تو ہوا دانتوں کے درمیان وقفوں سے گزر کر سیٹی بجاتی۔ علی کو نانی کے بوسوں سے لطف محسوس ہوتا اور ان سے بھی بڑھ کر ان سیٹیوں سے جو بوسوں کی سنگت کرتی تھیں۔

ذیشان ماموں نے نہ علیک کی، نہ سلیک، نہ سلام، نہ دعا۔ بس خاموش بیٹھے رہے۔ ان کی آنکھیں بجھے ہوئے فانوس کی مانند تھیں۔ چہرے پر وحشت تھی، بال بکھرے ہوئے تھے، گریباں کھلا تھا۔ علی ان پر غور کر رہا تھا کہ نانی نے اشارہ کیا کہ وہ ساتھ والے کمرے میں جائے۔ علی سمجھ گیا کہ نانی اس سے کوئی خاص بات کرنا چاہتی ہیں۔ چنانچہ وہ بڑی فرمانبرداری سے ان کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

نانی علی کے پیچھے پیچھے دوسرے کمرے میں پہنچیں۔

" کیا بات ہے، نانی اماں؟"

"بس بیٹا! بہت پریشان ہوں۔"

" کیوں؟"

"ذیشان کو دماغی دورے پڑنے لگے ہیں۔ فیصل آباد کے ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ کچھ عرصے کے لیے اسے دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کروانا چاہیے تاکہ اسے بجلی کے جھٹکے دیے جا سکیں۔"

"تو پھر ___؟"

"میں نے سوچا ہے اسے لاہور میں دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کروایا جائے، تم لوگ بھی یہاں ہو، اس کا خیال رکھو گے۔"

"جی بالکل۔ آپ بے فکر رہیں۔"

اگلے دن ذیشان ماموں کو دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ علی انہیں وہاں پہنچانے کے لیے ساتھ گیا۔ ضابطے کی کارروائی کے بعد انہیں ان کے وارڈ تک چھوڑنے گیا، لیکن وارڈ کے اندر داخل ہونے کے بجائے انہیں دروازے پر ہی الوداع کہہ کر چلا آیا۔ پھر نجانے کیوں ہسپتال کے لمبے اداس برآمدے میں سے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ عین اسی وقت ذیشان ماموں نے جو وارڈ اٹینڈنٹ کے ساتھ وارڈ میں داخل ہو

رہے تھے، مڑ کر علی کی طرف دیکھا۔ ان کے انداز میں زخمی پرندے کی بے بسی تھی۔ لڑکپن میں علی جب ابو کے امریکہ جانے کے بعد امی کے ساتھ فیصل آباد میں نانی کے گھر رہتا تھا تو صحن میں کھڑے کچنار کے درخت پر موسمِ بہار میں چڑیوں نے اپنے گھونسلے بنا لیے تھے۔ ایک دن علی نے دیکھا کہ انہی گھونسلوں میں سے ایک چڑیا کا بچہ اڑنے کی کوشش میں نیچے گرا، اور اس کی گردن ٹوٹ گئی۔ علی کو آج تک اس ننھی منی سی جان کے مردہ جسم کی بے بسی یاد تھی۔ وہ چڑیا کا بچہ شہیدِ تمنا تھا کہ اُڑنے کی آرزو میں تمام ہوا۔ اسے کچھ ایسی ہی بے بسی اور حسرتِ پرواز ذیشان ماموں کی آنکھوں میں اس وقت نظر آئی، جب انہوں نے وارڈ کے دروازے سے پلٹ کر رخصت ہوتے ہوئے علی کی طرف دیکھا۔

جب علی ہسپتال سے باہر نکلا تو زخمی پرندے کی پھڑ پھڑاہٹ اس کے کانوں میں گونج رہی تھی۔ باہر شہر کی سڑکیں سنسان تھیں۔ گرد آلود ہوا چل رہی تھی، جس کے زور سے ردی کاغذوں اور پولیتھین لفافوں کے بھنور بن رہے تھے۔ ایک غبار سا اس کی نظر کے آس پاس تھا۔

۸

علی ہر روز ذیشان ماموں سے ملاقات کے لیے جاتا۔ اگرچہ اسے یہ ملاقات بہت مہنگی پڑتی تھی۔ انہیں دیکھ کر ملال اس کے گرد جالا سا بنتا، جس میں وہ سارا دن الجھا رہتا۔ بعض اوقات اسے یوں محسوس ہوتا کہ ذیشان ماموں اس کے اندر بھی موجود ہیں۔ حالانکہ اس کا ذیشان ماموں سے خون کا کوئی رشتہ نہ تھا۔ کیا یہ قدرت کی ستم ظریفی نہیں تھی کہ اس کے باوجود ان کا عکس اس کے باطن کی لہروں میں موجزن تھا۔ اسے بھی ذیشان ماموں ہی کی طرح زندگی پر بے اعتباری تھی، اپنی ذات پر بے اعتمادی تھی۔ وہ انہی کی طرح لوگوں کا کھل کر سامنا نہ کر سکتا تھا۔ گھبرا جاتا تھا اور پھر گھبرا کر لکنت کی زد میں آ جاتا تھا۔ علی اپنے اندر موجود ذیشان ماموں کے پرتو سے خوفزدہ سا ہو جاتا تھا۔ یہ درست کہ ابھی یہ پرتو مدھم اور زرد تھا ___ مگر خدا جانے کب کیا ہو جائے۔

انہی دنوں امی کی کزن کا بیٹا جمی ایم۔ بی۔ اے میں داخلہ لینے کے لیے لاہور پہنچا۔ جمی دراز قد، فربہ اندام، نیلی آنکھوں والا، خوش مزاج، زندہ دل اور پُر اعتماد

تھا۔ علی نے جمی کو برسوں بعد دیکھا تھا۔ جمی کے والدین مدتوں متحدہ عرب امارات میں ملازمت کے سلسلے میں مقیم رہے تھے۔ اس لیے بچپن کے ابتدائی برسوں کے بعد علی اور جمی اب پہلی بار ملے تھے۔ اس لحاظ سے جمی علی کے لیے اجنبی تھا مگر یہ عجیب بات تھی کہ علی کو وہ مانوس اور اپنا اپنا محسوس ہوا۔ اس کی بھرپور شخصیت نے علی کے ٹھہرے پانیوں میں ہلچل سی پیدا کر دی۔ جمی کی دھوپ میں پکے خوشہ گندم جیسی رنگت نے اس کے دل کو کھینچا اور اس کی نیلی آنکھوں سے سارا منظر نیلا ہو گیا۔

نیلی لہر ہوا کی
جل نیلا دریا کا
نیلے پھول تھے ڈھلوانوں پر
دھند میں اڑتے نیلے پنچھی
نیلی آنکھ کی رنگت سے
شام کا منظر نیلا تھا

علی کو آج کل ڈاکٹر سلیم الرحمٰن کی یہ بھولی بسری نظم بار بار یاد آتی، بلکہ ورد زبان رہتی۔ وہ اکثر تنہائی میں سرگوشیوں میں اس نظم کو جذب و کیف کی حالت میں دوہراتا رہتا ــــــ اور اسے حیرت ہوتی کہ یہ نظم اس پر ساون کی گھٹاؤں کی طرح چھا کر کیوں اسے سیراب کر رہی ہے، حالانکہ اسے کبھی شعر یاد نہیں رہتے تھے۔ جانے کیسے اس کے شعور کے پاتال سے یہ نظم ابھری، جو اس نے شاید برسوں پہلے کسی رسالے میں پڑھی تھی اور باقی تمام غزلوں، نظموں کی طرح فراموش کر دی تھی۔

شہر کی ہوا گرد آلود تھی اور اس پر ٹریفک کا دھواں ایک مہلک زہر کی طرح فضا میں پھیلا ہوا تھا۔ فضا کی آلودگی سے علی کو اکثر نزلہ و زکام کی شکایت رہتی تھی۔

کے پیش نظر وہ سردیوں میں اپنے آپ کو گرم رکھتا اور گرمیوں میں بھی باہر زیادہ گھومنے پھرنے سے احتراز کرتا۔ مگر اب اس کی جمی سے گاڑھی چھننے لگی تھی۔ جمی زندگی سے بھرپور اور فعال مزاج کا مالک تھا۔ ٹک کر بیٹھنے کی اسے عادت نہ تھی۔ گھومنے پھرنے، سیر سپاٹے اور ہوٹل بازی کا دلدادہ تھا۔ ایک متمول گھرانے سے تعلق رکھنے کے باعث طالب علمی کے زمانے ہی میں اس کے پاس کار تھی، جو اسے متحرک ہونے میں سہولت پہنچاتی تھی۔

اس دفعہ جب علی کا گلا خراب ہوا اور نزلہ گلے سے ناک کی طرف رواں ہوا تو اُس نے حفاظتی تدابیر اختیار کرتے ہوئے جمی کے ساتھ گھومنے پھرنے سے انکار کرنے کی کوشش کی، مگر جمی بھی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہ تھا۔ اس نے ٹھان رکھی تھی کہ علی کو ہر صورت سیر سپاٹے کے دوران ساتھ دینے پر آمادہ کرے گا۔ علی اس کے سامنے بے بس سا ہو گیا۔ سو ہر شام جمی اسے زبردستی موٹر میں بٹھاتا اور اپنے ساتھ گھومنے کے لیے لے جاتا۔ وہ کبھی "سالٹ اینڈ پیپر" جا کر گاڑی میں بیٹھے بیٹھے کافی پیتے، کبھی لبرٹی مارکیٹ میں آوارہ گردی ہوتی اور کبھی ریس کورس پارک میں رات گئے تک چہل قدمی۔ ان مہمات کا نتیجہ یہ ہوا کہ علی کو نزلے زکام کے ساتھ شدید بخار چڑھا۔

بخار کی اذیت اپنی جگہ تھی، لیکن اس سے بھی بڑھ کر دہشت یہ تھی کہ بخار کی ہذیانی کیفیت میں علی کو دوبارہ ننجا دکھائی دینے لگا۔ وہ بستر پر دراز بخار سے پھنک رہا ہوتا، تو ننجا کبھی چھت پھاڑ کر اس کے پلنگ پر گرتا۔ کبھی وہ جنتر مار کر دیوار میں شگاف کرتا اور اس شگاف سے کمرے میں داخل ہوتا۔ کبھی فرش کا سینہ شق ہوتا اور اس میں سے نمودار ہوتا ___ اپنے چست سیاہ لباس اور نقاب سمیت، جس میں سے اس کی آنکھیں جھانکتیں ___ خون آشام اور مخمور، ہر مرتبہ وہ اچھل کر علی کے پلنگ پر پہنچ جاتا ___ پھر اپنے جنگجویانہ انداز میں رقصاں ہو جاتا ___ اور اس کے پاؤں گھوڑے کی ٹاپوں کی طرح علی کو روندتے چلے جاتے۔

کچھ دنوں میں علی کا بخار اتر گیا، لیکن ننجا نے خوابوں میں اس کا تعاقب جاری

رکھا۔ یہ عجیب بات تھی کہ وہ دن بدن مجا کی ہیبت میں کمی محسوس کر رہا تھا۔ وہ اسے کودتے، اچھلتے اور پھلانگتے دیکھتا، لیکن اس پر وہ پرانی دہشت نہ طاری ہوتی۔

علی اور جمی ڈرائنگ روم میں قالین پر صوفوں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ آپس میں کھسر پھسر کر رہے تھے۔ امی کمرے میں داخل ہوئیں تو انہیں رازدارانہ انداز میں سرگوشیاں کرتے دیکھ کر حیرت ہوئی۔

"کیا کھچڑی پک رہی ہے؟ غالباً کوئی سازش ہو رہی ہے۔"

امی نے خلافِ معمول شگفتگی کا اظہار کیا۔

"جی ___! جی کچھ نہیں۔"

علی اور جمی دونوں گھبرا کر بیک وقت بولے۔

"کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے؟"

امی بڑے موڈ تھیں۔

"بس ___ وہ ___ میں ___" جمی نے کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

"بس ___ وہ ___ میں ___ کیا؟"

امی نے مذاق سے جمی کے الفاظ کو دوہرایا۔

"دراصل بات یہ ہے امی! میں نے جمی سے کہا ہے کہ وہ ہوسٹل میں نہ جائے۔"

"ہوسٹل میں نہ جائے ___؟" امی کا ماتھا ٹھنکا۔

"تو پھر وہ کہاں رہے گا؟"

"میں نے کہا ہے کہ یہیں ہمارے ساتھ رہے۔"

آخر علی نے جرأت کرتے ہوئے کہہ ہی دیا۔

"یہاں ـــــ؟ ہمارے ساتھ ـــــ؟"

امی سنجیدہ ہو گئیں۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ علی اتنا نادان بھی ہو سکتا ہے۔

" مگر علی! بیٹا! ہمارے پاس تو مشکل سے سر چھپانے کی جگہ ہے۔ پہلے ہی تم اور حسین ایک کمرے میں رہتے ہو، تو جمی کو کون سا کمرہ دیں گے؟"

" وہ یہاں ڈرائینگ روم میں مجھ ی بستر لگا لیا کرے گا۔"

علی نے تجویز پیش کی۔

" یہاں۔۔۔۔؟ ڈرائینگ روم میں۔۔۔۔؟"

امی نے حیرت آمیز ناپسندیدگی سے دوہرایا۔

" جی۔ اس میں حرج ہی کیا ہے؟"

" دیکھو صاحبزادے! اس میں حرج ہے۔ ایک تو جمی امیر باپ کا بچہ ہے۔ اسے اس طرح رہنے کی عادت نہیں۔ دوسری بات یہ کہ میں اس کے ماں باپ کو کیا منہ دکھاؤں گی۔ وہ کہیں گے کہ اچھا سلوک کیا ہے ہمارے لاڈلے کے ساتھ۔"

جمی نے دخل اندازی کرتے ہوئے کہا۔" آنٹی! کوئی بات نہیں۔ میں نہیں برا مانتا، اگر میرا بستر ڈرائینگ روم میں فرش پر لگا دیا جائے۔"

" تم بے شک برا نہ مناؤ، لیکن میں برا مناؤں گی___ اگر تم نے ایسا کیا تو۔"

امی نے اپنا فیصلہ سنا دیا، اور علی کو ان کے تیور بتا رہے تھے کہ یہ ان کا آخری فیصلہ ہے۔

کسی قسم کی اپیل کی گنجائش نہیں تھی۔ چنانچہ علی اور جمی نے سر جوڑ کر کوئی نئی سکیم سوچنے کی کوشش کی۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے قریب رہنا چاہتے تھے۔ علی کو معلوم تھا کہ اگر جمی ہوسٹل میں رہنے لگا تو وہ علی کو زیادہ وقت نہ دے سکے گا۔ کافی سوچ وبچار کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ علی کے گھر کے آس پاس کسی کرائے کے کمرے کا سراغ لگانا چاہیے۔

چند دن کی تلاش کے بعد جس گلی میں علی کا گھر تھا، اس سے دو گلیاں ادھر ایک ایسے مکان کو دریافت کر لیا گیا، جس کی اوپر کی منزل میں ایک کمرہ خالی تھا اور مالک مکان اسے کرایے پر چڑھانا چاہتا تھا۔ کمرہ فراخ تھا اور سیڑھیاں مکان کے باہر ہی باہر سے گلی میں اترتی تھیں۔ کمرہ باقی مکان سے کٹا ہوا تھا۔ اس لیے جمی کو یہاں مکمل تخلیہ حاصل ہو سکتا تھا۔ کرایے کی اسے پرواہ نہ تھی، کیوں کہ وہ متمول گھرانے کا چشم و چراغ تھا۔ چنانچہ جمی نے مالک مکان کو منہ مانگا کرایہ ایڈوانس ادا کیا اور کمرہ لے لیا۔

علی اور جمی نے بڑی محنت اور محبت سے کمرے کو آراستہ کیا۔ فرش کے لیے جیل روڈ پر واقع محکمہ جیل کے شوروم سے قیدیوں کے ہاتھ کی بنی ہوئی خوبصورت قوس قزح کے رنگوں والی دری خریدی۔ میکلوڈ روڈ سے ایک خوبصورت پلنگ، جس کے سرہانے ہاتھی دانت کا کام تھا۔ بخشی مارکیٹ انارکلی سے میچنگ پردے لیے۔ اس کے علاوہ ایک نستعلیق سا صوفہ سیٹ، دو کرسیاں، رائٹنگ ٹیبل، خوبصورت لیمپ، سجاوٹ کے لیے مختلف قسم کے گلدان اور دیواروں پر آویزاں کرنے کے لیے مختلف جدید مغربی پوسٹرز خریدے۔

علی نے زیادہ تر وقت جمی کے کمرے میں گزارنا شروع کر دیا۔ جمی جب یونیورسٹی سے واپس آتا اور علی کمپیوٹر سائنس کالج سے، تو دونوں علی کے گھر ہی دوپہر کا کھانا کھاتے اور کچھ دیر وہاں گپ شپ کے بعد جمی کے کمرے میں آ جاتے۔

جمی کو بچوں سے بڑا پیار تھا۔ یوں لگتا تھا کہ بچپن کی سرحد کو پار کرنے کے باوجود اب تک اس کے اندر ایک بچہ ہمک رہا تھا۔ جمی کی دیکھا دیکھی علی کو بھی بچوں سے انس محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ وہ دونوں اپنے فارغ وقت کا ایک حصہ محلے کے بچوں کے ساتھ گذارتے۔ جمی ان کے ساتھ گلی میں کرکٹ کھیلنے کے علاوہ انہیں اپنے کمرے میں بھی لے آتا، جہاں وہ اور علی ان کے ساتھ گپ شپ کرتے۔ اسی گپ شپ کے دوران کچھ نمائشی کشتیاں اور کچھ سچ مچ کی لڑائیاں بھی ہو جایا کرتی تھیں۔

علی اور جمی اس بیگانہ ماحول میں وحشیانہ کشتی پر اتر آتے۔ جمی کیوں کہ فربہ اندام اور علی کے مقابلے میں لمبا چوڑا تھا، اس لیے وہ علی کو چت کر دیتا تھا۔ مگر چت ہونے سے پہلے علی اپنے نازک وجود کی پوری قوت کو صرف کر کے مقابلہ کرتا۔ وہ اس قسم کی ہاتھا پائی سے بے حد لطف اندوز ہوتا تھا۔ جانے کیوں؟ اکثر جب وہ دونوں ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے فرش پر گیند کی طرح لڑھک رہے ہوتے تو جمی کی قوت کے تشدد سے یا حادثاتی طور پر دیوار، کرسی یا میز سے ٹکرانے کے سبب علی کو جسم کے مختلف حصوں پر چوٹ آ جاتی اور اس کی نازک پھول کی پنکھڑی جیسی جلد پر جا بجا سرخ دھبے پڑ جاتے، جو بعد میں جامنی ہو جاتے تھے۔ کسی لاشعوری حجاب کے باعث وہ امی سے یہ سرخ اور جامنی داغ چھپانے کی کوشش کرتا۔ ان دنوں میں جب اس کے جسم پر جمی کے جسمانی کرتبوں کے یہ نقش کندہ ہوتے، وہ گھر میں برمودا شارٹس پہنے اور قمیص کے بغیر امی کا سامنا کرنے سے گریز کرتا۔ حالانکہ یوں برمودا شارٹس اور بغیر آستینوں کی قمیص اس کا مرغوب لباس تھا۔ جمی کے لاہور آنے سے پہلے وہ اکثر برمودا شارٹس اور بغیر آستینوں کی قمیص پہنے، نہ صرف گھر کے اندر بلکہ باہر گلی میں بھی چہل قدمی کیا کرتا تھا۔

۹

علی ڈرائینگ روم میں تین نشستوں والے صوفے پر دراز تھا۔ کھلی کھڑکی میں سے نیچے مالک مکان کے باغ میں لگے درختوں کی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ دور آسمان پر اکی دکی پتنگ بھی لہرا رہی تھی۔ علی کے قریب نیچے فرش پر بچھے قالین پر جمی بیٹھا تھا۔ جمی کی قربت علی کو عموماً سرشار کر دیتی تھی۔ جمی جب اس کی طرف اپنی نیلگوں آنکھیں اٹھاتا تو اس کا دل ڈبکی لگاتا۔ جب کبھی وہ علی کا ہاتھ تھامتا تو اسے کرنٹ سا لگتا۔ اس وقت بھی جمی نے اس پر اپنی نظریں مرکوز کی ہوئی تھیں اور اس کے ہاتھ کو ہاتھوں میں لے رکھا تھا۔ علی مخمور سا لیٹا تھا جیسے ٹینیسی کے لوئس ایٹرز جھیلوں میں سستا رہے ہوں۔

حسین بھائی ڈرائینگ روم میں بے دھڑک داخل ہوئے، لیکن وہاں علی اور جمی کو پا کر ٹھٹک سے گئے۔

"میں کہیں مخل تو نہیں ہوا۔"

یہ سوچ ان کے چہرے سے عیاں تھی۔

اگرچہ علی کے ذہن کے کسی کونے میں ہلکی سی ناگواری کا احساس سرسرا رہا تھا، مگر اس کے دل میں حسین بھائی کے لیے جو نرماہٹ تھی، اس کے باعث وہ اٹھ بیٹھا۔ اسے دکھائی دے رہا تھا کہ حسین بھائی کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں کسی ناقابلِ بیان جذبے سے جگمگا رہی تھیں، اور ہونٹوں میں ایک لرزشِ خفی تھی۔

"کیا بات ہے، حسین بھائی؟"

"میں رجو خالہ کے ہاں سے آرہا ہوں۔"

"وہ تو نظر آرہا ہے۔" علی شائستگی کو ملحوظ خاطر رکھنے کے باوجود قدرے طنزیہ لہجے میں بولا۔

"وہاں آج کل بڑی رونق ہے۔"

حسین بھائی نے نہایت سادگی سے علی کے ہلکے سے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے خبر دی۔

"وہ کیسے ___؟"

"بھئی! رجو خالہ کی بھتیجیاں آئی ہوئی ہیں۔ بڑی گپ شپ ہوتی ہے۔"

"رجو خالہ کی بھتیجیاں نہ بھی ہوں تو وہاں آپ کے لیے ایک مستقل کشش موجود ہے۔" علی نے شرارت آمیز سنجیدگی سے کہا۔

حسین بھائی سنی ان سنی کرتے ہوئے جھپاک سے ساتھ والے کمرے کے دروازے میں لٹکے پردے کے پیچھے غائب ہو گئے۔ جیسے کسی ڈرامے کا کوئی کردار سٹیج پر آنے کے بعد مکالمے ادا کرتا ہے اور سٹیج سے غائب ہو جاتا ہے۔

"حسین بھائی کچھ اوپرے اوپرے سے لگ رہے ہیں۔" جمی نے کہا۔

"ہاں، تم صحیح کہہ رہے ہو۔ پتہ نہیں کیا وجہ ہے؟" علی ذرا تشویش سے بولا۔

تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد جمی نے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"بات یہ ہے یار تو نے دھیان نہیں دیا کہ حسین بھائی کیوں اوپرے اوپرے سے لگ رہے ہیں۔"

"تم بتادو۔ بقراط کی اولاد۔" علی چڑ کر بولا۔

"اُلو کی دم، تیرا مشاہدہ ذرا کمزور ہے۔"

"اچھا تمہارا مشاہدہ بہت تیز ہے۔ تم بتادو۔"

"دراصل حسین بھائی نے ڈاڑھی منڈوادی ہے۔"

جمی نے انکشاف کیا اور علی دم بخود رہ گیا۔ جمی ٹھیک کہہ رہا تھا۔ حسین بھائی نے واقعی اپنی مدتوں کی پالی ڈاڑھی منڈوادی تھی۔

اگلے دن بھی حسین بھائی کی نقل و حرکت پُر اسرار رہی۔ علی کھانے والے کمرے میں بیٹھا تھا کہ حسین بھائی ایک ہاتھ میں عطر کی شیشی اور دوسرے ہاتھ میں رنگین لفافے لیے داخل ہوئے، اور پھر یکدم اپنے کمرے میں گھس گئے۔ علی نے کچھ پوچھنا مناسب نہ سمجھا کہ حسین بھائی اتنی رازداری سے کام لے رہے تھے اور وہ ان کی ذاتی زندگی میں دخل نہیں دینا چاہتا تھا۔ لیکن عطر کی شیشی اور رنگین لفافوں سے اس کے دل میں کھد بد ہو رہی تھی۔ وہ ٹوہ میں رہا، جونہی حسین بھائی غسل خانے گئے، وہ اندر کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے رائیٹنگ ٹیبل پر لیمپ کے نیچے ایک انتہائی خوبصورت پیڈ دمک رہا تھا۔ اس پیڈ کے صفحات کے نچلے حصے میں خوبصورت درختوں کا جھنڈ تھا اور بالائی حصے میں سفید کبوتروں کا غول تھا۔

ابھی علی اچھی طرح سے پیڈ کو دیکھنے بھی نہ پایا تھا کہ حسین بھائی غسل خانے سے نکلے اور چھلانگ لگا کر علی کے ہاتھ سے پیڈ یوں دبوچ لیا، جیسے کوئی بھوکی چیل کسی کے ہاتھ سے ماس کا ٹکڑا اچک لیتی ہے۔ پھر انہوں نے پیڈ کو علی کی نظروں سے اوجھل کرنے کے لیے پیٹھ پیچھے چھپا لیا اور علی سے کہا کہ وہ جائے اور پی پُو کو کھانا دے، کیوں کہ پی پُو بھوک سے

ہلکان ہو رہا ہے۔علی کو برا تو لگا، مگر اس نے احتراماً ان کے حکم کی تعمیل کی۔ ویسے علی کو یہ ساری رازداری کھل رہی تھی۔ آخر رجو خالہ کی بیٹی ہی کو تو خط لکھا جا رہا تھا۔ یہ ساری پردہ پوشی بے معنی تھی، کیوں کہ علی تو پہلے ہی اس راز میں شریک تھا۔

دو گھنٹے بعد حسین بھائی ہاتھ میں سربمہر رنگین لفافے سمیت اپنے کمرے سے برآمد ہوئے۔لفافے سے عطر کی لپٹیں آ رہی تھیں۔ حسین بھائی بڑی تیزی سے ڈرائینگ روم اور ڈرائینگ روم سے گزرتے ہوئے باہر نکل گئے۔لفافے اور اس میں بند خط پر اس قدر عطر چھڑکا تھا کہ وہ جدھر جدھر سے گزرے، ان کے جانے کے بعد بھی وہ جگہیں مہکتی رہیں۔

حسین بھائی خط بیرو ڈاک کرنے کے بعد لوٹے تو پھولے نہیں سما رہے تھے، جیسے کوئی بہت بڑا معرکہ سر کر آئے ہوں۔

تیسرے دن شام کے قریب حسین بھائی بن ٹھن کے گھر سے غائب ہو گئے۔علی سمجھ گیا تھا کہ وہ رجو خالہ کے ہاں گئے ہوں گے۔ مگر جب رات گئے تک وہ نہ لوٹے تو امی اور علی دونوں پریشان ہو گئے۔امی نے علی کو کہا کہ وہ ان کا پتہ کرے۔علی نے جمی کو ساتھ لیا اور سب سے پہلے رجو خالہ کے ہاں گیا۔معلوم ہوا کہ وہ تو وہاں سے کب کے جا چکے ہیں۔ اس کے بعد علی باغ میں بھی گیا، جہاں وہ اکثر چہل قدمی کرتے تھے،لیکن وہاں بھی انہیں نہ پایا۔تھک ہار کر وہ مجبوراً گھر لوٹ آیا۔امی بے حال سی ہو رہی تھیں۔انہیں تسلی دی، سمجھایا کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔بس حسین بھائی موڈی سے ہیں۔یہ بھی ان کے کسی موڈ کا نتیجہ ہے کہ وہ واپس نہیں آئے۔موڈ درست ہوا تو وہ خود ہی لوٹ آئیں گے۔بہر حال اگر وہ کل تک نہ لوٹے تو پھر پولیس کی مدد لیں گے، تھانے میں رپورٹ کروائیں گے۔ان تمام تسلیوں کے باوجود امی نے رات کانٹوں پر بسر کی۔

صبح دس بجے کے قریب حسین بھائی گھر میں داخل ہوئے۔ امی غم و غصہ کے ملے جلے جذبات سے بھری بیٹھی تھیں، لیکن حسین بھائی کی حالت زار دیکھ کر چپ ہو گئیں۔ حسین بھائی کی آنکھوں میں کرب کے سرخ ڈورے تھے، ہونٹوں پر اذیت کی پپڑی جمی تھی، کندھے جھکے ہوئے تھے اور سارے بدن میں لرزش تھی۔ کسی سے کچھ کہے سنے بغیر وہ اپنے کمرے میں چلے گئے اور منہ سر لپیٹ کر بستر پر دراز ہو گئے۔

اگلے دن شام کے قریب علی نے ہمت کی اور حسین بھائی سے بات کرنے کی کوشش کی۔ وہ علی سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔

"حسین بھائی! ماجرا کیا ہے؟ جو کچھ بھی ہے مجھے بے دھڑک بتا دیں۔ مجھ میں ہر بات سننے کا حوصلہ بھی ہے، اپنے تک بات رکھنے کا ظرف بھی اور سب کچھ سمجھنے کی صلاحیت بھی۔" علی نے اپنے ساتھ لپٹے حسین بھائی کو تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

حسین بھائی اپنے آنسو پونچھتے ہوتے رندھی آواز میں بولے۔ "وہ جو ر جو خالہ کی بیٹی ہے نا۔۔۔۔ تسنیم۔۔۔۔"

"جی، جسے آپ پسند کرتے ہیں۔"

"میں۔۔۔۔ میں صرف پسند نہیں کرتا، بلکہ مجھے اس سے محبت ہے۔"

"تو پھر۔۔۔۔ جہاں تک مجھے علم ہے، وہ بھی آپ کو چاہتی ہے۔"

حسین بھائی نے اپنا سینہ ہاتھوں سے دباتے ہوئے ایک سرد آہ بھری۔

"وہ بھی مجھے چاہتی تھی۔"

"چاہتی تھی___؟" علی نے تعجب سے دریافت کیا۔ "یہ ماضی کا صیغہ کیوں؟"

"میں کسی اور کو الزام نہیں دے سکتا۔ میں نے تو خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری ہے۔"

"صحیح صحیح بتائیں کیا ہوا ہے۔ یہ پہیلیاں نہ بجھوائیں۔" علی نے تنگ کر کہا۔

"میں نے تمہیں بتایا تھا کہ رجو خالہ کی بھتیجیاں آئی ہوئی ہیں۔"

"جی! آپ نے ذکر تو کیا تھا۔"

"بس ___ میں نے خط لکھ دیا۔"

حسین بھائی نے عجیب بے بسی سے یہ الفاظ ادا کیے۔

"کون سا۔۔۔؟ وہی کبوتروں والے پیڈ پر ___ عطر میں بسا ہوا جو آپ نے دو تین دن پہلے پوسٹ کیا تھا۔"

"ہاں ___ وہی منحوس خط۔"

"اس میں آپ نے کیا لکھا، اور کس کو لکھا؟"

حسین بھائی تڑپ سے اٹھے۔

"کیا آپ نے تسنیم کو وہ خط لکھا تھا؟"

حسین بھائی نے نمناک آنکھوں سے علی کی طرف دیکھا اور کوئی جواب نہیں دیا۔

لیکن علی نے اپنی جرح جاری رکھی۔

"کیا تسنیم ناراض ہوگئی ہے؟ آپ نے اس خط میں کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں لکھ دی تھی؟"

آخر حسین بھائی نے ہتھیار ڈال دیئے اور جواب دینے پر مجبور ہو گئے۔

"وہ خط ___ میں نے تسنیم کو نہیں لکھا تھا ___ لیکن ___ وہ ناراض ہوگئی۔"

"کیوں ___؟"

"اس خط میں جو کچھ لکھا تھا ___ اس کے سبب۔"

"پتہ نہیں آپ کیا انٹ شنٹ بولے چلے جا رہے ہیں۔" علی، حسین بھائی کے احترام کو پس پشت ڈال کر چڑچڑاہٹ سے بولا۔

حسین بھائی کی آنکھوں سے دو آنسو گرے اور ان کی قمیص کے دامن میں جذب ہو گئے۔ وہ تھوڑی دیر چپ بیٹھے رہے، پھر علی کی طرف دیکھے بغیر یوں بولنے لگے، جیسے اپنے آپ سے کلام کر رہے ہوں۔

"بعض دفعہ جذبوں کے رنگ پھیل کر دھبے بن جاتے ہیں ___ خطوط واضح نہیں رہتے ___ زاویے دھندلا جاتے ہیں ___ اور سب کچھ آپس میں گڈمڈ ہو جاتا ہے۔

مجھے تسنیم سے محبت ہے ___ لیکن جب میں رجو خالہ کی بھتیجی ___ نکہت سے ملا، تو اس کی شخصیت کے شوخ و شنگ رنگوں کے سیلاب کا پہلا ریلا ہی مجھے اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ اس نے میرے حواس کو مشتعل کر دیا ___ اور میں ___ ایک بچہ بن گیا، جو کسی رنگین غبارے کو دیکھ کر بے طرح تڑپ اٹھتا ہے ___ اس کا حصول ___ اس کو پانے کی تمنا ___ اس کی آرزو ___ اس کے ذہن پر اس طرح چھا جاتی ہے ___ اسے گھیر لیتی ہے کہ وہ اس بات پر غور ہی نہیں کرتا کہ پل بھر میں غبارہ پھٹ جائے گا ___ یا اس کے ہاتھوں سے پھسل کر فضا میں تیرنے لگے گا۔"

حسین بھائی نے گردن جھکالی اور غور و فکر میں کھو گئے۔ ان کے چہرے پر حیرت اور تاسف ___ تعجب اور پچھتاوے کا گنجلک تانا بانا بنتا چلا جا رہا تھا۔

چند لمحے کھو جانے کے بعد ان کی خود کلامی پھر جاری ہوئی۔

"مگر ___ حیرت انگیز بات ___ ناقابل حل معمہ یہ ہے کہ میں آگاہ تھا ___ پوری طرح سے کہ میں تسنیم کے لیے ایک گہرا اور مستقل نوعیت کا جذبہ محسوس کرتا ہوں، جب کہ نکہت کے لیے میرے محسوسات ___ اپنی شدت کے باوجود، محض عارضی فریفتگی اور وقتی ابال کی مانند ہیں ___ لیکن پھر بھی میں نے لمحے کی غلیل کھینچ کر ایک شرارتی لڑکے کی طرح ___ جسے اپنی انگلیوں پر اختیار اور قابو نہیں ہوتا ___ فاختہ کو کنکر سے گھائل کر دیا۔"

"حسین بھائی! میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ___ ذرا کھل کر بات کریں۔"

"میں تسنیم سے محبت کرتا ہوں ___ لیکن اس کے باوجود میں نے نکہت کو خط لکھا ___ اور وہ بھی رومانی ___ اور اس آفت کی پڑیا نے تسنیم کو وہ خط پڑھوادیا۔"

"اچھا، اب سمجھا۔ تو گویا تسنیم آپ سے ناراض ہوگئی ہے۔"

"وہ محض ناراض نہیں، بلکہ اس نے مجھ سے نہ ملنے اور قطع تعلق کی قسم کھائی ہے۔"

"کم آن، حسین بھائی! وہ صرف لمحاتی طور پر ___ غصے میں ایسا کہہ رہی ہے۔ چاہنے والوں کے درمیان ایسی ناچاقیاں ہو ہی جاتی ہیں۔ آپ بھلا کیوں اسے فیصلہ کن اور قطعی سمجھ بیٹھے ہیں۔"

"اس لیے کہ مجھے معلوم ہے ___ کوئی آواز مجھے بتارہی ہے کہ اس ڈرامے کا ڈراپ سین ہو چکا ہے۔"

علی نے حسین بھائی کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے دلاسہ دیا۔

"بس آپ بالکل فکر نہ کریں۔ میں خود آپ دونوں کی صلح کروادوں گا۔ آپ اٹھیں، منہ ہاتھ دھوئیں ___ اور کھانا کھائیں۔"

علی کے اصرار پر حسین بھائی اٹھے، منہ ہاتھ دھویا اور دو تین لقمے زہر مار کیے۔ پھر علی نے انہیں ویلیم (Valium) دے کر سلا دیا۔

۱۰
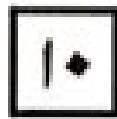
علی اور جمی شام کو کار میں سیر کے لیے نکلے۔ سیر کے دوران جمی نے دیکھا کہ علی کچھ اکھڑا اکھڑا سا ہے۔

"کیا بات ہے علی؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"نہیں یار! کچھ تو ہے۔ تم میرے ساتھ ہوتے ہوئے بھی میرے ساتھ نہیں۔"

"نہیں، ایسا نہیں ہے۔"

"کچھ تو ہے، جس کی رازداری ہے ___ اچھا ___ چلو مجھے اندازہ لگانے دو۔ میرا خیال ہے ___ تم حسین بھائی کی وجہ سے پریشان ہو۔ اصل قصہ کیا ہے؟ حسین بھائی نے اپنی یہ حالت کیوں بنا رکھی ہے؟"

"بس ویسے ہی ___ ان کی طبیعت ناساز ہے۔"

علی نے پردہ پوشی کرتے ہوئے کہا۔

"یار! ہم سے بھی چھپار ہے ہو۔"

جمی نے شکوہ کیا۔ پھر اس نے اپنا ہاتھ سٹیئرنگ وہیل سے اٹھا کر علی کی گود میں رکھے ہاتھوں پر رکھ دیا۔ جمی کے لمس سے علی کی مدافعت کمزور پڑنے لگی۔ عموماً جب جمی اسے چھوتا تو اسے پگھلا کر رکھ دیتا۔ اس وقت بھی اس کے پسینے بھرے ہاتھوں کے نم آلود لمس نے علی کے حسین بھائی سے وفاداری کے جذبے کو مدہم کر دیا۔

"بات یہ ہے کہ حسین بھائی کو ساری عمر میں عشق بھی ہوا تو رجو خالہ کی بیٹی تسنیم سے۔"

"اچھا!" جمی عشق کے ذکر سے محظوظ ہوتے ہوئے بولا۔

"لیکن ___ انہوں نے خط لکھ دیا تسنیم کے بجائے اس کی کزن کو، جو آج کل رجو خالہ کے ہاں ٹھہری ہوئی ہے ___ اور اس نے وہ محبت نامہ تسنیم کو پڑھوا دیا۔"

"اس کے باوجود حسین بھائی کو اصرار ہے کہ وہ تسنیم سے محبت کرتے ہیں۔"

"ہاں، اور اب وہ پریشان حال ہیں کہ تسنیم نے انہیں الٹی میٹم دے دیا ہے کہ وہ اب ان سے کبھی نہیں ملے گی۔"

یکدم جمی کا تنومند جسم قہقہوں سے لرزنے لگا۔ اسے بے اختیار ہنسی کا دورہ سا پڑ گیا۔ اور وہ اتنا بے قابو ہو گیا کہ گاڑی اس سے سنبھل نہیں رہی تھی۔

"کیا ہوا؟ ___ خدا کے لیے گاڑی کھڑی کر دو اور پھر ہنسو۔" علی نے پریشان ہو کر کہا۔

جمی نے اسے معقول مشورہ سمجھتے ہوئے اس پر عمل کیا اور ایک درخت کے نیچے گاڑی روک لی۔ لیکن اس کی نہ تھمنے والی ہنسی کا فوارہ ابلتا رہا۔ علی کو حسین بھائی کے راز کے انکشاف کے بعد اس کا اس طرح بے قابو ہو جانا ایک آنکھ نہیں بھا رہا تھا۔ جب بھی وہ جمی کو ہنسنے سے منع کرتا تو جمی اس کے ارشاد کی تعمیل میں دو تین سیکنڈ اپنے اوپر قابو پانے کی کوشش کرتا، مگر تھوڑی ہی دیر میں ضبط کا یہ کمزور سا بند ٹوٹ جاتا اور وہ دوبارہ ہنسنے لگا۔ ہنستے

ہنستے اس کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ بہے۔ اور پیٹ میں بل پڑنے لگے، جس کی وجہ سے اسے دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبانا پڑا تا کہ درد کم ہو جائے۔

علی کو شدید غصہ آ رہا تھا۔ آخر میں اس کا پارہ انتہا کو پہنچ گیا۔ اس کے چہرے کی خشونت کو خطرے کا سگنل سمجھتے ہوئے جمی نے اس کا بازو سہلایا اور کہنے لگا۔

"او۔ کے، یار! بتاتا ہوں ___ ابھی بتاتا ہوں کہ مجھے ہنسی کیوں آ رہی ہے۔ حسین بھائی کا قصہ سن کر مجھے اچانک ایک نرسری رائم یاد آئی۔"

"نرسری رائم؟ ___ "علی ششدر رہ گیا۔

"بھلا اس کا کیا تعلق ہے حسین بھائی کے عشق سے؟"

"حوصلہ، جانِ من! حوصلہ ___ صبر ___ ابھی بتاتا ہوں۔"

"بس، اب بتا بھی چکو۔" علی نے چڑچڑاہٹ سے کہا۔

"بات یہ ہے کہ مجھے بے اختیار ہمپٹی ڈمپٹی یاد آ گیا تھا۔"

"ہمپٹی ڈمپٹی ___!"

"ہاں، مجھے بس جانے کیوں یہ نرسری رائم یاد آ گئی ___

Humpty Dumpty sat on a wall

"Humpty Dumpty had a great fall

"نان سینس، یار! یہ تم کیا بکواس کر رہے ہو؟"

جمی پر اس سرزنش کا الٹا اثر ہوا۔ اس پر پھر اسی کیفیت کا ورود ہوا اور وہ ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ علی دھیمے مزاج کا مالک تھا اور عموماً اسے غصہ نہیں آتا تھا، مگر اس وقت اسے نجانے کیا ہوا کہ وہ غصے سے کھولنے لگا۔ جمی اس کی حالت دیکھ کر ضبط کے بجائے اور زیادہ ہنسنے لگا۔

باہر اترتے ہوئے کہا۔

جمی نے اس کا بازو پکڑ کر اسے روکنے کی کوشش کی۔

"یار! تم یونہی اتنے سنجیدہ ہو گئے۔ اپنے اندر کچھ حس مزاح پیدا کرو۔"

"حس مزاح___!" علی کھولنے لگا۔

میرا بھائی ایک آشوب سے گزر رہا ہے اور تمہیں دل لگی اور ہنسی مذاق کی سوجھی ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے سنگدل ہو۔ اگر ایک انسان ہونے کے ناطے نہیں تو کم از کم میرے بھائی کی حیثیت سے ہی حسین بھائی کے دکھ کا کچھ تو احترام کرو۔ لیکن تم ہو کہ مجنونانہ انداز میں ان کا مذاق اڑا رہے ہو۔ تمہیں بتایا تو تھا کہ حسین بھائی ابو کی بے وفائی کے سبب دنیا سے منہ موڑ بیٹھے تھے۔ تسنیم کی محبت سے ان میں مثبت اور صحت مند تبدیلیاں ظاہر ہو رہی تھیں۔ وہ اس تابندہ زندگی کی طرف پلٹ رہے تھے، جسے انہوں نے آنکھ بھر کر دیکھے بغیر ہی رد کر دیا تھا۔ مجھے تو ڈر ہے کہ اگر تسنیم نے اپنا دامن جھٹک دیا تو وہ دوبارہ اندھے کنوئیں میں منہ کے بل گر جائیں گے___ اس اندھے کنوئیں میں، جس سے وہ مدتوں بعد نکلے تھے۔"

اس ساری تفصیل کا جمی پر مطلق اثر نہ ہوا اس کا ہسٹریا جاری رہا، اور وہ شریر ہنسی کے ریلوں کے درمیان گنگناتا رہا۔

"Humpty Dumpty sat on a wall

Humpty Dumpty had a great fall-"

علی کا منہ غصے سے لال بھبوکا ہو گیا۔ وہ تیزی سے کار کے ادھ کھلے دروازے سے باہر نکل فٹ پاتھ پر کھڑا ہو گیا۔ پھر اس نے اتنے زور سے کار کا دروازہ بند کیا کہ جمی کی ننھی منی گاڑی لرز گئی۔ وہاں درخت کے نیچے جہاں جمی نے کار کھڑی کی تھی، ایک رکشا کھڑا تھا، جس میں رکشے والا کسی سواری کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ علی اچھل کر رکشا میں بیٹھا اور رکشا والے کو چلنے کا اشارہ کیا۔ اس میں غصے کی وجہ سے ایسا رعب و دبدبہ پیدا ہو گیا تھا کہ رکشا

والے نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے رکشا چلا دیا۔

علی گھر پہنچا تو امی کھانے کی گول میز پر اپنی نئی سلی ہوئی قمیص پھیلا کر ترپائی کر رہی تھیں۔ وہ علی کے آتشیں گلابی چہرے کو دیکھ کر متوحش سی ہوئیں، لیکن اس سے کچھ پوچھنے کی جرأت نہ ہوئی کہ اس کے چہرے پر ایسا جلال تھا، جو امی نے اس سے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ علی نے ان سے کہا کہ اگر جمی آئے اور اس کے بارے میں دریافت کرے تو کہہ دیں کہ وہ گھر پہ نہیں ہے۔ امی کو تعجب ہوا، مگر مصلحتاً چپ رہیں۔

علی اپنے کمرے میں گیا، جوگرز اتار کر پلنگ کے نیچے پھینک دیے اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس کا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ خون شریانوں میں تیزی سے دوڑتے ہوئے اس کے سر میں جمع ہو رہا تھا۔ وہ اس ہیجانی کیفیت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے اٹھا اور ننگے پاؤں غسل خانے میں گیا۔ اس نے سنک کے اوپر لگے آئینے میں چہرہ دیکھا تو اسے اپنے بجائے ایک اجنبی صورت نظر آئی۔ اس نے ٹھنڈے پانی کا نلکا کھولا اور منہ پر چھینٹے دیے تاکہ اندر کی آتش فشانی کا اثر کم ہو جائے۔ کافی دیر تک چہرے پر پانی پھینکنے کے بعد اسے قدرے سکون کا احساس ہوا۔ تپتے ہوئے پاؤں کے تلوے بھی غسل خانے کے سرد فرش کے مس سے ٹھنڈک محسوس کر رہے تھے۔

جمی کی آواز کھانے والے کمرے سے آئی تو علی نے فوراً نلکا بند کر دیا کہ بہتے ہوئے پانی کی آواز سے اسے پتہ نہ چل جائے کہ وہ غسل خانے میں ہے۔ جمی نے امی سے علی کے بارے میں پوچھا۔ امی نے علی کی ہدایت کے مطابق کہہ دیا کہ وہ گھر پر موجود نہیں، اگرچہ ایسا کہنے میں انہیں تامل اور توقف محسوس ہو رہا تھا۔ علی کو معلوم تھا کہ انہیں یہ چھوٹا سا جھوٹ بولتے ہوئے کس قدر تکلیف ہو رہی تھی کہ ان کا تعلق ایسے گروہ سے تھا، جو اب بھی موجودہ زمانے میں بھی دیانت داری اور سچ پر ایمان رکھتا تھا۔

جمی سمجھ گیا تھا کہ علی اندر اپنے کمرے میں ہے، لیکن وہ امی کے احترام

خاموشی سے واپس چلا گیا۔ علی کو یوں اس کے کچھ کہے سنے بغیر پلٹ جانے سے جہاں ایک غصیلی طمانیت حاصل ہوئی وہاں اسے مایوسی اور ناگواری کا بھی ناقابل فہم احساس ہوا۔

کئی دن گذر گئے۔ جمی نے کئی مرتبہ فون پر علی سے بات کرنے کی کوشش کی، مگر علی نے ہر مرتبہ اس کی یہ کوشش ناکام بنادی۔ اگر وہ خود فون موصول کرتا تو جمی کی آواز سن کر فوراً فون بند کر دیتا۔ اگر امی یا حسین بھائی فون اٹھاتے تو علی انہیں اشارے سے سمجھا دیتا کہ کہہ دیں وہ گھر پر موجود نہیں۔

علی کو خود حیرت تھی کہ جمی کی ہنسی سے اس کے اندر اتنا شدید ردعمل کیوں پیدا ہوا۔ اسے تو غصے کی سرخ آندھی نے یوں کبھی اپنی لپیٹ میں نہیں لیا تھا۔ شاید اس شدید جذباتی منفی ردعمل کا سبب یہ تھا کہ اور کسی نے اسے یوں نہ چاہا تھا، جیسے جمی نے یا پھر وہ تسمہ جس سے وہ اور جمی بندھ گئے تھے، اتنا سخت اور مضبوط تھا کہ ذرا کھنچنے سے وہ گوشت میں کھُب کے زخم بن رہا تھا۔

علی کے شدید منفی جذباتی ردعمل کی وجہ کچھ بھی ہو، یہ واضح تھا کہ جمی سے دوری اور علیحدگی نے اس کے اندر سٹیپ کے میدانوں کی بساط بچھا دی تھی، جہاں گھاس کے سمندروں میں صرف سرد تنہا ہوا دوڑتی پھرتی ہے ___ اور جہاں دور دور تک کوئی ذی روح دکھائی نہیں دیتا۔ علی کو اپنے اندر دوڑتی سرد ہوا سے نجات حاصل کرنے کے لیے مصروف رہنے کی اشد ضرورت تھی۔ سب سے پہلے اس کی توجہ حسین بھائی کی جانب مبذول ہوئی۔ حسین بھائی کی حالت تسنیم کی بے رخی کے سبب مخدوش تھی۔ اسے ان سے کیا ہوا وعدہ یاد آیا کہ وہ تسنیم کی خفگی کو دور کرنے اور ان دونوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی کوشش کرے گا۔ وہ اپنا وعدہ ایفا کرنے کے لیے سرگرم عمل ہو گیا۔

کئی دن کی لگاتار کوشش اور منت سماجت کے بعد بالآخر تسنیم نے علی سے ملاقات کی رضامندی ظاہر کی۔ علی وقتِ مقررہ پر تسنیم کے ہاں پہنچا تو گھر میں سناٹا سا تھا۔ تسنیم کے

گھر والے غالباً کسی تقریب میں شرکت کے لیے گئے ہوئے تھے۔ علی نے دیکھا کہ تسنیم ایک زرد رُو لڑکی تھی، لیکن اس کے اندر آتش فروزاں تھی، جس سے اس کی آنکھوں میں الاؤ سلگ رہے تھے اور رخساروں پر سرخی جھلک رہی تھی۔ ایک شستہ خاتون کی طرح اس نے اپنے اندر بھڑکنے والے شعلوں کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اس میں ایک دوری تھی، جیسے ستارہ میں ہوتی ہے، جو اصل میں بھڑک رہا ہوتا ہے، مگر زمین سے ٹھنڈا اور چمکتا دکھائی دیتا ہے۔

علی تسنیم کے سامنے صوفہ پر بیٹھا تھا۔ کچھ دیر ان کے درمیان خاموشی چھائی رہی۔ علی شرمساری سے بوجھل تھا اور تسنیم سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا، جیسے حسین بھائی کے بجائے وہ خود مجرم اور گناہگار ہو۔ آخر تسنیم نے اس سکوت کو توڑنے میں پہل کی۔

"آپ غالباً اپنے بھائی کی وکالت کے لیے آئے ہیں؟"

علی گھبرا سا گیا۔

"جی ___ جی میرا مطلب ہے کہ میں یہ درخواست لے کر حاضر ہوا ہوں کہ آپ حسین بھائی کی خطا معاف کر دیں۔"

"خطا ___ ؟ معافی ___ ؟" تسنیم نے زہرخند کہا۔ "بھئی! بھلا میں کون سی کوئی ملکہ عالیہ ہوں کہ لوگ میری شان میں گستاخی کریں، اور میں انہیں سزا یا جزا دے سکوں۔"

"خیر خطا تو حسین بھائی سے سرزد ہوئی ہے۔"

"خطا ___ ؟ کون سی خطا ___ ؟ کیسی خطا ___ ؟"

"اگرچہ مجھے یہ حق نہیں پہنچتا کہ میں آپ سے بے تکلف ہو سکوں، لیکن موجودہ صورتِ حال کا تقاضہ ہے کہ میں کھل کر بات کروں۔"

"جی۔" تسنیم بے جذبات لہجے میں بولی۔

"حسین بھائی کی خطا یہ ہے کہ آپ سے یگانگت ہوتے ہوئے وہ کسی اور کی طرف ملتفت ہوئے۔"

تسنیم چمک کر بولی۔ "بھئی تو وہ آزاد ہیں، جس سے چاہیں التفات کریں، جس وقت تک چاہیں کریں اور جس سے چاہیں بے رخی برتیں۔ آپ اور میں کون ہوتے ہیں قدغن لگانے والے۔"

"آپ صدمے سے اس قسم کی باتیں کر رہی ہیں۔"

"صدمہ! بھئی صدمہ!" تسنیم نے تنک کر کہا۔ "کس نامعقول کو ہوا ہے صدمہ۔ مجھے تو خوشی ہوئی ہے کہ انہوں نے میری غلط فہمی رفع کر دی۔"

"غلط فہمی ___؟"

"جی، جذبوں کے استحکام کے بارے میں غلط فہمی ___ یا پھر یوں کہیے ___ کہ خوش فہمی۔ میں تو حسین کی ممنون ہوں کہ انہوں نے بروقت جذبوں کے بودے پن کو منکشف کیا ___ اور مجھے فیصلہ کرنے میں آسانی ہوئی۔"

"فیصلہ ___ ؟ کیسا فیصلہ ___؟"

علی کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بج اٹھی۔

"گذشتہ دو تین ماہ سے ایک معقول شخص کے گھر والے میرا رشتہ مانگ رہے تھے۔ میرے والدین نے اس رشتے کو پسند کیا تھا۔ میں ہی حیل وحجت سے تاخیر کر رہی تھی حسین کی وجہ سے، لیکن ان کے طرز عمل نے مجھے اس نتیجہ پر پہنچایا کہ مجھے یہ رشتہ قبول کر لینا چاہیے ___ بلا تاخیر۔ سو میں نے اپنے والدین کو اپنے فیصلے سے آگاہ کر دیا ہے۔"

تسنیم کے لہجے میں سرد آنچ تھی، جیسے برف کی آگ۔

"شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی ہے۔"

اس نے حسین بھائی کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی۔

"کب ہے آپ کی شادی؟"

علی متوحش تھا۔

"مہینہ بعد۔"

تسنیم کی آواز میں قبولیت تھی ___ ایک سرد کر دینے والی ___ مہلک قبولیت ___ جس طرح ہم بڑھاپے اور موت کو قبول کر لیتے ہیں۔

"اوہ! میرے خدا!" علی تڑپ کر بولا۔ "دیکھیں! اتنا سنگین قدم نہ اٹھائیں ___ یہ تو حسین بھائی کے لیے پروانۂ موت ہوگا۔"

تسنیم نے علی کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں تیر کی طرح اس کے وجود کو چھیدتی ہوئی پار ہو گئیں۔

"مسٹر علی! اس دنیا میں کون کسی کے لیے مرتا ہے ___ ہم سب بڑے ڈھیٹ واقع ہوئے ہیں۔ لیکن اگر ہم یہ فرض کر بھی لیں ___ صرف ایک لمحے کے لیے ___ کہ جو کچھ آپ کہہ رہے ہیں، درست ہے تو آپ کیسے یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ کس کی اذیت بھاری ہے ___ اس کی جو ایک دفعہ مر کر آزاد ہو جاتا ہے ___ یا اس کی جو زندہ درگور ___ اپنے مردہ وجود کو اپنے ہی کندھوں پر اٹھائے اس کارزارِ حیات میں عمر قید کاٹتا ہے۔"

اس پل علی کو اس زرد رو، نازک سی لڑکی کے فولادی ہونے کا احساس ہوا ___ اس کے فیصلے کے اٹل ہونے کا ___ اپنی بے بسی کا ___ اور حسین بھائی کی تقدیر کا۔ ان سب حقیقتوں کے سامنے وہ کتنا حقیر تھا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کا جسم سکڑ کر منحنی ہو گیا ہے ___ اور جس صوفے پر وہ بیٹھا تھا، اس کی جسامت کئی گنا بڑھ گئی ہے۔ وہ صوفہ اس کے لیے بڑا تھا ___ بہت بڑا ___ اور وہ صوفے میں دھنستا چلا گیا۔

تسنیم نے اٹھتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ہے کہ اب آپ کو چلا جانا چاہیے۔"

علی نے اپنے وجود کی تمام تر قوت کے ساتھ حسین بھائی کو ڈوبنے سے بچانے کی آخری کوشش کی۔

"بعض دفعہ ہم سے کوئی فعل سرزد ہو جاتا ہے، لیکن ہم نہیں جانتے کیوں۔

ہمارے اندر گہری، تاریک اور پُر اسرار قوتیں ہیں، جو ہماری تاریں کھینچتی ہیں ___ اور ہم کٹھ پتلیوں کی طرح رقص کرنے لگتے ہیں۔ بغیر یہ جانے کہ کیوں اور کیسے۔"

"اگر یہ بات حسین کے عمل کا نفسیاتی جواب ہے تو میرے فیصلے اور ردِ عمل کا جواز بھی ہے۔ میرے اندر بھی ایسی ہی گہری، تاریک اور غیر عقلی قوتیں موجود ہیں، جو مجھے اس فیصلے کی طرف لے گئی ہیں۔"

علی نے بمشکل اپنے آپ کو صوفے سے نکالا، جس میں وہ دھنستا چلا جا رہا تھا۔ تسنیم نے آگے بڑھ کر شائستگی سے اس کے لیے ڈرائینگ روم کا دروازہ کھولا تاکہ وہ چلا جائے۔

"آئندہ ___ آپ یا حسین، مجھ سے ملنے کی کوشش نہ کریں۔ کیوں کہ میری شادی ہونے والی ہے ___ اور اس معاشرے میں شادی کا مطلب ہے اپنی کشتیاں جلا کر ہمیشہ کے لیے ایک اجنبی کی کائنات کا حصہ بن جانا۔"

جب علی اپنے بوجھل جسم کو گھسیٹتے ہوئے دروازے سے باہر نکلا تو تسنیم نے نہایت آہستگی سے دروازے کے پٹ بند کیے اور ڈرائینگ روم کی بتی بجھا دی۔

باہر بارش ہو رہی تھی۔ بوگن ویلیا کی بیلیں بارش کی بوچھاڑ سے لرزاں تھیں اور تسنیم کے گھر کے لان میں بیلوں سے گرے ہوئے کاسنی، سفید اور نارنجی پھول روشوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ علی رین کوٹ اور ٹوپی پہن کر موٹر سائیکل پر بیٹھا، جو پورچ میں کھڑی تھی۔ پھر اس نے حسین بھائی کی آنکھوں سے آخری بار تسنیم کے گھر، لان اور روشوں پر بکھرے بوگن ویلیا کے پھولوں کو دیکھا ___ اور موٹر سائیکل سٹارٹ کر دی۔ اس وقت نجانے کیوں اس کے ذہن میں ہمپٹی ڈمپٹی کی رائم کا یہ حصہ گونج رہا تھا:

"All the King's horses and all the King's men

Couldn't put Humpty Dumpty in his place again."

11
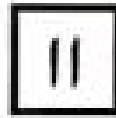
ایک مہینے بعد تسنیم کی شادی ہو گئی۔ حسین بھائی واپس اپنی تنگ و تار دنیا میں پناہ گزیں ہوئے، ڈاڑھی بڑھائی اور عبائے درویشی جو اتار پھینکی تھی، پھر سے پہن لی۔ مذہبی کتب کے مطالعہ میں غرق ہو گئے، عبادت میں محو رہنے لگے۔ بی۔ ایس۔ سی کی تیاری ترک کر دی۔ امی پر گہرے پانیوں کی خاموشی نے آن ڈیرہ جمایا۔ وہ گھر کے کام کاج میں مصروف رہتیں، مگر یوں جیسے کوئی نیند میں چل پھر رہا ہو۔ ذیشان ماموں صحت یاب نہیں ہوئے تھے، لیکن ہسپتال والوں نے انہیں فارغ کر دیا تھا۔ جی نے بالآخر علی کو منانے کی کوششیں ترک کر دیں تھیں اور گرمی کی چھٹیاں گذارنے اپنے عزیزوں کے پاس فیصل آباد چلا گیا تھا۔

گھڑی کی سوئیاں چل رہی تھیں، لیکن وقت آگے کی سمت حرکت نہیں کر رہا تھا بلکہ ایک دائرے میں گھوم رہا تھا۔ وہی روز و شب کا تواتر ___ دنوں کا میکانکی تسلسل۔ علی صبح وقتِ مقررہ پر اٹھتا ___ ناشتہ کرتا ___ اور کمپیوٹر کے رموز پر حاوی ہونے کی کوشش کرتا۔ دوپہر کو امی اور علی سایوں کی طرح خاموشی سے کھانا کھاتے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد

قیلولہ، شام کو واک، رات کو ٹی۔ وی، اور پھر نیند میں پناہ۔ اس بے رنگ تواتر میں کہیں چاشنی نہیں تھی۔ سیسیفس کی طرح ہر روز صبح وہ پہاڑ کے دامن سے بھاری بھرکم پتھر چوٹی تک پہنچاتا، اور شام کو وہ پتھر لڑھک کر دامنِ کوہ میں اتر جاتا۔ ہر صبح وہ انہی کاموں کی ابتدا کرتا جو اس نے گزرے ہوئے کل بھی کیے تھے ___ اور آنے والے کل بھی کرنے تھے۔

علی کو اکثر جمی یاد آتا۔ غسل خانے میں سنک کے اوپر آویزاں آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر، ڈرائینگ روم کی کھڑکی سے نیچے مالک مکان کے صحن میں اُگے بیری کے درختوں پر کھلتی دھوپ دیکھ کر، ٹیلی فون آپریٹس کو اپنی جگہ خاموش پڑے دیکھ کر، کسی سڑک پر ٹریفک کے ہنگامے میں جمی کی کار جیسی کار دیکھ کر ___ غرض کہ ہر جگہ اور ہر موقعے پر اسے جمی کی یاد ستاتی۔ جمی کی یادیں اس کے وجود سے یوں چمٹ گئی تھیں، جیسے کوئی بیل کسی درخت کے تنے سے لپٹ کر آہستہ آہستہ اس کی ساری شاخوں پر پھیل جاتی ہے، حتیٰ کہ وہ درخت ڈوب جاتا ہے۔

کئی مرتبہ علی فرصت کے لمحات میں اپنے اور جمی کے درمیان پائے جانے والے تعلق کے بارے میں سوچتا، لیکن اس رشتے ___ اس بندھن کی نوعیت کو پوری طرح سمجھ نہ پاتا۔ جب وہ جمی کے قریب تھا تو اپنے اور اس کے تعلق کے بارے میں سوچنے کی نہ فراغت تھی، نہ ضرورت۔ اب فاصلے تھے، لیکن جذبوں کی اصلیت دھندلانے کے بجائے نکھر کر سامنے آنے لگی تھی۔

جمی کی قربت نے علی کو بہت سی چیزیں بخشی تھیں ___ بہت سی نئی کیفیات سے روشناس کروایا تھا۔ اسے شاعری سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ شعر اس کے سر کے اوپر سے گزر جاتا تھا۔ وہ ایک کان سے شعر سنتا اور دوسرے سے اڑا دیتا تھا، مگر جمی سے ملاقات کے بعد شعر اس کے دل کو چھونے لگے تھے۔ محبت کے وہ اظہار جو اسے کلیشے دکھائی دیتے تھے، اب سچے اور حقیقی معلوم ہوتے تھے۔ ان سب احساسات سے بھی بڑھ کر یہ کہ اسے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے جسم کے ہونے کا احساس ہوا تھا۔ اس سے پہلے وہ دوسروں کی زبانی اپنی خوش

شکلی کا ذکر سنتا تھا، لیکن اس نے کبھی یہ محسوس نہیں کیا تھا کہ وہ سچ مچ دلکش ہے۔ اب اسے اپنے جسم کے بڑھتے کے حسن کا شعور ہو چلا تھا۔

علی کو جمی کے ساتھ بسر کیے ہوئے دن خواب کی طرح نظر آنے لگے تھے ___ شیریں اور مختصر۔ اسے یاد آتا تھا جمی کے کمرے کو سجانا، جمی کے کمرے میں محلے کے بچوں کو جمع کر کے ان سے گپ شپ کرنا، دونوں کا پہروں ایک دوسرے کی آنکھوں میں جھانکنا، ایک دوسرے کے ہاتھوں کو سہلانا، وہ خرمستیاں ___ ایک دوسرے سے لپٹ جانا اور فرش پر ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے گیند کی طرح لڑھکتے جانا، جمی کا اس کی نازک جلد پر تشدد، جو اسے مسحور کر دیتا تھا۔ اسے اب ان نشانوں اور زخموں کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ وہ ایک کسک سی محسوس کرتا کہ اب اسے امی سے نیل اور زخم چھپانے کے بہانے نہیں تراشنے پڑتے۔ اب وہ سب چہلیں ___ اٹھکیلیاں ___ وارفتگیاں خیال ہو گئی تھیں۔ بس وہ یادوں کے دالانوں میں اکیلا مارے مارے پھر رہا تھا۔

بعض دفعہ ایک بہت بڑا سوالیہ نشان اس کے ذہن میں ابھرتا ___ آخر جمی اور اس کا باہم ہونا کیا معنی رکھتا تھا؟ کیا وہ دونوں کزنز ہیں، اس لیے یگانگت محسوس کرتے تھے ___ یا دوست ہونے کے ناطے؟

پھر وہ سوچتا، کیا وہ صرف دوست ہیں ___ یا اس سے بڑھ کر کچھ؟ اس نقطے پر پہنچ کر اس کی سوچ رک سی جاتی تھی۔ شاید وہ لاشعوری طور پر اس سرحد کو عبور نہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے مبہم سا احساس تھا کہ اس سے آگے کوئی خطرہ تھا ___ کوئی پھندا لگا تھا جس میں پھنس کر شاید وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے، لیکن اس اندیشے کے باوجود اس کے اندر چھپی کوئی عفریت بعض دفعہ اس کے کان میں سرگوشی کرتی ___ "کہیں میں وہ تو نہیں" اور وہ فوراً اس سوچ کا گلا گھونٹ دیتا۔

ایک دن علی اپنے کمرے میں لیٹا چھت کو تک رہا تھا کہ اس کی سوچ کا دھارا بہتے

بجتے اسی خطرناک نقطے پر آ کر ایسا رکا اور اٹکا کہ وہ بوکھلا گیا۔ گھبرا کے اس نے نرگس کا سوچا۔ اسے دو تین مرتبہ فون کرنے کی کوشش کی، لیکن کامیابی نہ ہوئی۔ لائن مصروف تھی۔

علی مایوس ہو کر ڈرائینگ روم میں بیٹھ گیا۔ وہ ٹی۔ وی لگا کر اسے دیکھنے لگا۔ لیکن اس کا دھیان بٹا ہوا تھا۔ وہ ٹی۔ وی پروگرام میں دلچسپی نہیں محسوس کر رہا تھا۔ اس نے ٹی۔ وی بند کر دیا اور گھر کے مختلف کمروں میں اِدھر اُدھر گھومنے لگا۔ وہ بے چین تھا ___ ٹک کر بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ اس کے اندر کوئی آواز کہہ رہی تھی ___ "جلدی کرو ___ چلو ___ کچھ کرو ___ مصروف ہو جاؤ ___ ورنہ ___"

علی اس آواز کی گونج سے سہم سا گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ "کچھ تو کرنا چاہیے ___ کچھ ___ کچھ بھی۔"

پھر وہ اپنے کمرے میں گیا اور کپڑے بدل کر فون پر اطلاع دیے بغیر نرگس کے گھر کی طرف چل پڑا۔

نرگس نے گھنٹی بجنے پر فلیٹ کا دروازہ کھولا تو علی کو دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ اس نے علی کو بارہا فون کیے تھے، لیکن وہ مراسم بڑھانے کے لیے آمادہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ اب جب کہ وہ تقریباً مایوس ہو چکی تھی، علی کا یوں اچانک نمودار ہونا، حیران کن تھا۔

"ارے، آپ!"

"جی، میں۔"

"آپ آج کیسے بھٹک کر یہاں آ گئے؟"

"بس ___"

"کیا مجھ سے ملنے کو جی چاہ رہا تھا؟"

"جی ___ ؟ جی۔" حسبِ معمول علی کی زبان لڑکھڑا سی گئی۔ سو اس نے کسی لمبے

جملے کے بجائے ایک ہی لفظ پر اکتفا کیا۔

"زہے نصیب۔" نرگس کھلکھلا کر بولی۔

"اندر آئیے۔" نرگس نے دروازے میں سے ہٹتے ہوئے علی کو اندر آنے کو کہا۔

"یہاں تشریف رکھیے۔"

نرگس نے صوفے کی طرف اشارہ کیا۔

"میں ابھی آتی ہوں۔"

وہ باورچی خانے میں چولہے پر چائے کے لیے پانی رکھنے کے لیے چلی گئی۔

علی کو وہاں نرگس کے ڈرائینگ روم میں بیٹھے بیٹھے پشیمانی ہوئی۔

"مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔"

پھر وہ سوچنے لگا___ "آخر میں یہاں کیوں آیا ہوں؟"

"بھلا آپ کس سوچ میں گم ہیں؟" نرگس نے ڈرائینگ روم میں داخل ہوتے ہوئے سوال کیا۔

علی نے جواب ایک شرمیلی سی مسکراہٹ کی صورت میں دیا۔

نرگس علی کے بہت قریب صوفے پر بیٹھ گئی۔ علی کا جسم سکڑ سا گیا۔ نرگس کو اس گریز کا احساس ہو گیا تھا، لیکن وہ بھی ڈھٹائی سے اپنی جگہ قائم رہی۔

"آپ اتنا عرصہ کہاں غائب رہے؟"

"مصروف تھا۔"

"بھلا ایسی بھی کیا مصروفیت؟"

"میرے ماموں بیمار تھے۔"

"اچھا۔"

"دو تین مہینے ہسپتال میں رہے۔"

"اچھا ___ تو کیا آپ ان کی لینیوانبل میں مصروف رہے؟"

"جی۔" علی نے سفید جھوٹ بولا۔

نرگس کی آنکھوں میں شرارت بھی تھی اور بے اعتباری بھی۔

"میں ابھی آتی ہوں۔"

تھوڑی دیر میں وہ ٹرے میں چائے کی دو پیالیاں سجا کر لے آئی۔ ایک پیالی اس نے علی کو دی اور دوسری خود لے لی۔

علی نظریں جھکائے چائے پینے لگا۔ نرگس چائے کی چسکیاں لیتی رہی اور ساتھ ساتھ علی کا جائزہ بھی۔ علی کو اس کی جانچتی پرکھتی نگاہوں سے بے آرامی سی محسوس ہو رہی تھی، مگر وہ بڑی استقامت سے اس سے نظریں چار کرنے سے بچ رہا تھا۔

" لگتا ہے آپ کبھی کسی کے قریب نہیں آئے۔"

علی کو شرمساری سے ہلکا سا پسینہ آ گیا۔ اس نے چائے کی پیالی میں دیکھا۔ سکواڈرن لیڈر حبیب چائے کی پیالی میں بیٹھا طنزیہ مسکرا رہا تھا۔

"تم نے ابھی تک کسی عورت کو جنسی طور پر فتح نہیں کیا۔" سکواڈرن لیڈر حبیب کی آواز گونجی۔

"مرد بنو، مرد۔"

یہ کہہ کر سکواڈرن لیڈر حبیب نے جست لگائی اور علی کے منہ پر چپت رسید کی۔ پیالی میں پڑی چائے اچھلی اور علی کے سفید کپڑوں پر تجریدی آرٹ کا نمونہ بنا دیا۔

"اوہ! یہ کیا ہوا۔"

نرگس نے شرارت بھرے انداز میں ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے ٹشو پیپر سے کپڑوں کو خشک کرنے کے لیے ہاتھ بڑھایا، علی نے چابک دستی سے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو روکا اور اس میں دبا ہوا ٹشو پیپر لے کر خود اپنے آلودہ لباس کو پونچھنے لگا۔

"آپ تو بہت شرماتے ہیں۔"
پھر نرگس نے ٹھنڈی آہ بھری۔
"لیکن اس طرح آپ اور بھی پیارے لگتے ہیں۔"
نرگس علی کے اور قریب سرک آئی۔ علی کا پنڈا تپ سا گیا۔ نرگس بغور اس کا مطالعہ کرتی رہی۔
"ہم Intimate ہوتے جائیں گے، لیکن شاید آپ یونہی شرماتے رہیں گے۔"
نرگس نے اٹھلا کر کہا۔ "اناڑی بلما۔"
علی ساکت اور مؤدب بیٹھا رہا۔ وہ نرگس کے بجائے سید حا دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا اور اس کے دونوں ہاتھ اس کے گھٹنوں پر رکھے تھے۔ آخر تھک کر نرگس نے پہل کی اور اس کا ایک ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ علی کو اس ہاتھ کے لمس سے تنفر سا محسوس ہوا، مگر اس نے آداب شائستگی کے مدنظر نرگس کے ہاتھوں کو جھٹکا نہیں۔
کچھ دیر نرگس علی کا ہاتھ سہلاتی رہی ___ شاید صرف چند ثانیوں کے لیے، لیکن علی کو یوں محسوس ہوا جیسے کئی گھنٹے گزر گئے ہیں۔ پھر نرگس نے اپنی بانہیں علی کے گلے میں ڈال دیں۔
"آپ کی بیٹی کہاں ہے؟" علی نے نرگس کی مزید پیش قدمی روکنے کے لیے کہا۔
"وہ آج اپنے ماموں کے ہاں گئی ہوئی ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔"
نرگس نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں پر رکھ دیے۔ علی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ کسی لجلجے پلاسٹک کا بوسہ لے رہا ہے۔ نرگس کے بوسے میں تختی صاف کرنے والی گاچنی کا ذائقہ تھا۔ وہ تڑپ کر نرگس کی آغوش سے نکلا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ نرگس کی آنکھوں میں پہلے حیرت نمودار ہوئی ___ پھر غصہ، لیکن علی اس کے ردعمل سے مکمل طور پر بے خبر معلوم ہوتا تھا۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا ___ فوراً۔ اس کی نگاہوں کے سامنے دھند تنی تھی اور اس کے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ وہ اندھا دھند دروازے کی طرف لپکا اور نرگس کے فلیٹ سے باہر نکل گیا۔

۱۲

ایک دن علی گھر پہنچا تو امی بے چینی سے کھانے والے کمرے میں ٹہل رہی تھیں۔
ان کی کیفیت بتا رہی تھی کہ جو تلوار سر پر لٹکی تھی، نیچے آن گری تھی۔

"علی! تم کہاں تھے؟"

"میں ذرا ایک کام سے چلا گیا تھا۔"

"میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔"

"کیوں ___؟"

"تمہارے ___ تمہارے ابو کا فون آیا تھا۔"

"ابو ___ ابو کا!"

علی کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

"ہاں۔" امی نے شکست خوردگی سے کہا۔

"کہاں سے؟ امریکہ سے؟"

"ہاں، امریکہ سے۔"

"کیوں___؟"

"گویا رپ وین ونکل اپنے پندرہ سالہ خواب سے بیدار ہو چکا ہے۔" علی نے سوچا۔

"انہوں نے اطلاع دی ہے کہ وہ پرسوں لاہور پہنچ رہے ہیں۔"

"لاہور!"

"ہاں۔"

"اکیلے آرہے ہیں یا___؟"

"نہیں ان کی بیوی بھی ساتھ ہوگی۔"

"کہاں ٹھہر رہے ہیں؟"

"یہاں___ اور کہاں؟"

تڑاخ سے کوئی آئینہ علی کے باطن میں چکنا چور ہو گیا۔

"یہاں___ یہ تو زیادتی ہے۔"

علی غصے سے تپ گیا۔

"رپ وین ونکل خوابِ غفلت سے بیدار ہو چکا ہے، لیکن اسے احساس نہیں کہ پندرہ سالوں میں دنیا بدل چکی ہے۔" علی نے سوچا۔

"میں انہیں یہاں اپنی بیوی کے ساتھ نہیں ٹھہرنے دوں گا۔"

"کیوں؟" امی نے حیرت سے پوچھا۔

"کیونکہ یہ توہین ہے___ میری___ آپ کی___ اور حسین بھائی کی۔"

"یہ سب درست ہے، لیکن یہ مت بھولو کہ وہ تمہارا باپ ہے___ اور میں اب تک اس کی منکوحہ ہوں۔"

"میرا باپ اور آپ کا شوہر ___ رشتے ___ امی! یہ سب محض الفاظ ہیں۔ اس شخص نے جسے آپ میرا باپ اور اپنا شوہر تسلیم کرتی ہیں، کب ان رشتوں کا بھرم رکھا ہے کہ ہم اس کی پاسداری کریں۔"

"ہاں ___ نہیں رکھا۔ مگر کیا ہمیں اس کی سطح پر اتر آنا چاہیے؟ کیا پتھر کا جواب پتھر اور گالی کا جواب گالی سے دینا انسانیت ہے؟"

"امی! اخلاقیات اور اقدار پرانے زمانے کی باتیں ہیں ___ اس پرانے زمانے کی جو دم توڑ چکا ہے ___ حتیٰ کہ اس کی لاش کا بھی کوئی وارث نہیں۔"

"بند کرو ___ یہ خوفناک باتیں۔ جب تک میں زندہ ہوں اس گھر میں وہی ہوگا، جو میں چاہوں گی۔"

علی نے اس روایتی تحکم کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے، اور بڑبڑاتا ہوا اپنے کمرے کی طرف چلا گیا۔

اس رات علی سو نہیں سکا۔ وہ تلملاتا رہا ___ اپنی نئی شکست پر۔ امی نے اس کے مقابلے میں اپنے ایسے شوہر کو ترجیح دی تھی، جس نے ان کے پھول کی پتیوں جیسے نازک جذبوں کو بے دردی سے مسل دیا تھا ___ جس نے کبھی علی کے وجود کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا تھا ___ اور جس نے حسین بھائی کے پندارِ وفا کا بھرم بھی توڑ دیا تھا، لیکن ___ پھر بھی اس نے آج بازی جیت لی تھی۔

علی بستر سے اٹھا اور ڈرائنگ روم میں چلا گیا۔ پھر وہ سگریٹ سلگا کر ڈرائنگ روم کی کھڑکی میں جا بیٹھا، جو نیچے مالک مکان کے صحن میں لگے بیریوں کے سروں پر کھلتی تھی۔ رات بھیگتی جا رہی تھی، لیکن شہر کی ہزاروں آنکھیں اب بھی کھلی تھیں ___ روشن تھیں ___ اور سینکڑوں آوازیں تھیں، جو دھیمی ہونے کے باوجود شاہراہ کے عقب میں واقع گلیوں

میں داخل ہو رہی تھیں۔ کمرے کی تاریکی میں علی کے ہاتھ میں پکڑا ہوا سگریٹ یوں روشن تھا، جیسے رات کی سیاہی میں رواں ریل گاڑی کے ماتھے کی بتی ___ مگر ___ اس کی زندگی کی ریل گاڑی تو کسی نامعلوم سمت میں چلی جا رہی تھی۔

علی سگریٹ کے کش لگاتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ اسے اس شخص سے ___ اپنے باپ سے کتنی نفرت ہے ___ ناقابلِ بیان حد تک ___ وہ نفرت جس کا اظہار اس نے کسی اور سے تو کیا، خود اپنے آپ سے بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُسے بعض دفعہ یہ گمان گزرتا تھا کہ وہ شخص ___ وہ قابلِ نفرت شخص اس کے اندر ___ اس کے گوشت پوست ___ بلکہ اس کے سارے وجود میں رچا بسا ہے۔ بارہا لوگوں نے اور امی نے بھی جسمانی مشابہت کے علاوہ اس بات کا بھی ذکر کیا تھا کہ اس کی عادات واطوار بھی اپنے باپ سے بہت ملتے تھے۔ وہ انہی کی طرح شستہ وشائستہ، خوش پوش اور خوش لباس تھا۔ انہی کی طرح بظاہر دھیمے مزاج کا، لیکن جب غصہ آتا تو انہی کی طرح وہ معقولیت کی حدود سے تجاوز کر جاتا تھا۔

"مجھ میں میرا باپ سانس لے رہا ہے ___ ایک بے مہر قاتل، جو مجھ میں زندہ ہے۔

___ اور علی خوفزدہ ہو گیا، اس دشمن سے جو اس سے باہر نہیں، بلکہ اس کے اندر مکین تھا۔

علی ہوائی اڈے پر پہنچا تو کراچی سے آنے والی پرواز اتر چکی تھی۔ اس نے اپنے ایک دوست سے کار لے لی تھی تاکہ ابو ہوائی اڈے سے گھر تک آرام سے پہنچ سکیں۔ اگرچہ علی کو پندرہ برس ہوئے تھے ابو کو دیکھے ہوئے، مگر اسے یقین تھا کہ وہ انہیں پہچان لے گا۔ وہ دس سال کا تھا جب ابو امریکہ سدھارے تھے۔ اس لیے اس کے ذہن میں ان کا دھندلا سا

نقشہ محفوظ تھا۔ امی کے پاس جو فیملی البم تھی، اس میں ابو کی کئی تصویریں تھیں۔ اس لیے اسے اعتماد تھا کہ وہ اتنا عرصہ ابو کو نہ دیکھنے کے باوجود ان کی شناخت کر لے گا۔

مسافر باہر نکلنا شروع ہوئے تو ان میں درمیانہ عمر، چھریرے بدن، گندمی رنگ، بادامی سوٹ میں ملبوس، سر پر فلیٹ ہیٹ رکھے ایک شخص بھی تھا۔ علی نے فوراً ابو کو پہچان لیا اور ان کی طرف بڑھا۔ علی بچھڑے ہوئے باپ کی روایتی شفقت کا منتظر تھا، لیکن ابو نے نہ اس کا ماتھا چوما اور نہ اس سے بغلگیر ہوئے۔ ان میں اجنبیت کا تکلف موجود تھا، سو انہوں نے محض ہاتھ ملانے پر اکتفا کیا۔ علی نے بھی رسمی طور پر ان سے ہاتھ ملایا اور بس ___ باپ بیٹے دونوں کھچے کھچے سے تھے۔

"کیسے ہو، علی؟"

"ٹھیک ہوں، جی۔" علی نے ابو کے ہاتھ سے سوٹ کیس پکڑتے ہوئے ان کے میکانکی، بے معنی سوال کا رسمی سا جواب دیا۔

علی ابو کے ہاتھ سے سوٹ کیس لینے کے بعد تھوڑی دیر وہیں کھڑا رہا اور ابو کے ساتھ آنے والے مسافروں کو دیکھتا رہا۔ وہ سمجھ گئے کہ علی کس کا منتظر ہے۔

"شاید تم سلمہ کے انتظار میں ہو؟"

"جی۔" علی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"وہ تو کراچی میں اپنے بھائیوں کے ہاں رک گئی ہے۔"

"لاہور نہیں آئیں گی؟"

"نہیں، وہ کراچی سے سیدھی اسلام آباد چلی جائے گی، اور میں بھی ہفتہ دس دن تک اس کے پاس اسلام آباد پہنچ جاؤں گا۔"

"اللہ! تیرا شکر ہے ___ وہ نہیں آئی ___ خس کم جہاں پاک۔" علی نے دل ہی دل میں کہا۔

علی اور ابو ہوائی اڈے کی عمارت سے نکل کر کار پارک میں کھڑی کار میں بیٹھ گئے۔علی نے ان کے لیے کار کی اگلی نشست کا دروازہ کھول کر انہیں بٹھایا، سوٹ کیس ڈگی میں رکھا اور کار سٹارٹ کر دی۔ اُن دونوں کے درمیان گھر پہنچنے تک صرف چند باتیں ہوئیں۔

"علی! تم آج کل کیا کر رہے ہو؟"

"جی، میں کمپیوٹر سائنس کا کورس کر رہا ہوں۔"

"اچھا ___ اور حسین؟"

"حسین بھائی ___؟"

"ہاں، ہاں۔ بھئی میں تمہارے بھائی ___ حسین کے بارے میں دریافت کر رہا ہوں۔"

"تمہارا بھائی ___ جیسے وہ آپ کے کچھ نہیں لگتے ___ جیسے آپ سے کوئی رشتہ نہیں ان کا۔" علی نے سوچا اور دبے ہوئے غصے کا سانپ اس کے اندر پھنکارا۔

"وہ ___ وہ تو کچھ نہیں کرتے۔"

"وہ کچھ نہیں کرتے۔" ابو نے علی کا جملہ دوہرایا، جیسے وہ اسے سمجھ نہیں سکے۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" ابو نے تھوڑے وقفے سے پوچھا۔

"انہوں نے بی۔ ایس۔ سی میں پڑھائی چھوڑ دی تھی۔"

ابو کو یقیناً تعجب ہوا ہوگا، لیکن ان کی آنکھوں پر چڑھے سیاہ چشمے کے سبب ان کے تاثرات کا صحیح اندازہ ممکن نہیں تھا۔

علی نے اپنی گلی میں داخل ہو کر گھر کے دروازے کے سامنے گاڑی روک لی۔ ابو سرد مہر مغربی اجنبیت سے کار سے اترے۔ علی نے دروازے میں لگی گھنٹی بجائی۔ امی خود دروازہ کھولنے آئیں۔ وہ ابو کو دیکھ کر ایک پل کو ٹھٹک سی گئیں۔ حالانکہ وہ دو تین دن سے ان

کا سامنا کرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہو رہی تھیں۔

"نصیرہ! کیسی ہو؟" ابو نے دہلیز پار کرتے ہوئے بغیر کسی جذبے کے پوچھا۔

"جی، اللہ کا شکر ہے۔" امی نے جواب دیا۔

علی کو یوں محسوس ہوا جیسے دو سائے روبرو تھے۔

ابو گھر کے اندر داخل ہوئے اور ہر چیز کو غور سے دیکھنے لگے۔

"مجھے کس کمرے میں ٹھہرایا ہے؟"

"جی، ادھر ہے آپ کا کمرہ۔"

علی انہیں امی کے کمرے کی طرف لے گیا۔ امی چند دنوں کے لیے علی اور حسین کے کمرے میں منتقل ہو گئی تھیں اور علی کو رات ڈرائینگ روم میں سونا تھا تاکہ امی اور حسین بھائی سہولت سے کمرے میں رہ سکیں۔

امی نے چائے تیار کی۔ ابو غسل خانے سے نہا دھو کر تازہ دم باہر نکلے۔ حسین بھائی حسب معمول غائب تھے۔ کھانے کی میز پر ابو، امی اور علی تھوڑی دیر بیٹھے، رسمی سی بات چیت ہوئی جس کے بعد ابو نے کہا کہ وہ نیویارک سے کراچی اور کراچی سے لاہور تک کے طویل سفر سے بہت تھک چکے ہیں۔ اس لیے سونا چاہتے ہیں۔ پھر وہ اپنے کمرے میں آرام کے لیے چلے گئے۔

ابو شام کے قریب اٹھ کر ڈرائینگ روم میں آ بیٹھے اور امی کو کافی بنانے کو کہا۔ علی کو یہ دیکھ دیکھ کر طیش آ رہا تھا کہ امی ابو کے سامنے ایک زرخرید غلام کی طرح سر جھکائے ان کے ہر حکم کی تعمیل کر رہی ہیں۔

ابو نے کافی پینے کے بعد جس انداز میں علی کی طرف دیکھا، علی سمجھ گیا کہ کوئی

"علی!"

"جی ___"

"یہ تم کمپیوٹر کی طرف کیوں چل دیئے۔ نصیرہ نے بتایا ہے کہ پہلے تو تم فضائیہ میں تھے۔"

علی کے جسم میں تناؤ سا پیدا ہوا۔

"بات یہ ہے ابو! کہ مجھے فضائیہ والوں نے معطل کر دیا تھا۔"

"معطل ___؟" ابو کے لہجے میں کڑک تھی۔

"جی۔ مجھ میں جہاز اڑانے کی صلاحیت نہیں تھی۔"

علی نے معصوم دیانت داری سے اپنی ناکامی کا اعتراف کیا۔

"گویا تم نااہل ثابت ہوئے ہو۔"

ابو کا پارہ چڑھنے لگا۔

"مگر ___ کیوں؟ اس شخص کو غصے یا احتساب کا کیا حق حاصل ہے، جس نے اپنی لوحِ زندگی سے انہیں حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا تھا۔" علی اس ناانصافی پر غور کر رہا تھا۔

"___ اور ___ حسین نے تو مجھے بے حد مایوس کیا ہے۔"

"اس لیے کہ آپ نے اُسے بے حد مایوس کیا ہے۔" علی کے لبوں پر یہ بات آتے آتے رک گئی، کچھ ابو کے چند روزہ مہمان ہونے کے ناطے ___ اور کچھ امی کی ناراضگی کے مدِنظر۔

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ علی نے دل ہی دل میں شکر کیا کہ اسے ڈرائنگ روم کے کھچے ہوئے ماحول سے مفر کا کوئی بہانہ ملا ہے۔ وہ فوراً اٹھا اور کھانے والے کمرے میں گیا، جہاں ٹیلی فون رکھا تھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔

"ہیلو!"

"ہیلو، علی ہیں ___؟"

علی نے فوراً مس ڈینیل کی آواز پہچان لی۔

"جی۔ میں بول رہا ہوں۔"

"اچھا میں نے تو پہچانا ہی نہیں تمہیں۔ تمہاری آواز کچھ بدلی بدلی سی ہے۔ کیا وجہ ہے؟"

"جی کچھ نہیں۔ ذرا گلا خراب ہے۔"

علی کیا بتاتا کہ وہ ڈائنامائٹ پر بیٹھا ہے۔ سو بہانہ کر کے ٹال دیا۔

"کیسے ہو؟"

"فائن، تھینک یو۔"

"گلا خراب ہے اور پھر بھی کہہ رہے ہو ___ فائن۔"

مس ڈینیل کی ہنسی کی کھنک سنائی دی۔

علی کو حسبِ معمول اس چھیڑ چھاڑ کا جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔

"تم نے تو ہمیں بھلا ہی دیا۔"

"نہیں جی۔ بھلا میں آپ کو کیسے بھلا سکتا ہوں۔"

"آج شام کو ___ ہو سکے تو آؤ۔"

"ضرور۔ آپ بلائیں اور میں نہ آؤں ___ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔"

"وعدہ؟"

"جی، وعدہ۔"

"تو پھر ___ خدا حافظ۔"

"سی یو۔"

علی ٹیلی فون بند کر کے ڈرائنگ روم میں آنے کے بجائے گھر سے باہر نکلنا چاہتا

تھا، لیکن ابو کی گرجدار آواز نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔

"علی!"

"جی۔"

"ذرا ادھر آنا۔"

"جی، اچھا۔" علی نے ایک فرمانبردار بیٹے کی طرح جواب دیا۔

وہ پردہ ہٹا کر ڈرائینگ روم میں داخل ہوا تو احساس کے راڈار نے خطرے کا سگنل دیا۔ ابو بھرے بیٹھے تھے۔ انہیں تو جیسے صرف کوئی بہانہ درکار تھا۔

"یہ تم ٹیلی فون پر کس سے بات کر رہے تھے؟"

"مس ڈینیل سے۔"

"وہ کون ہے؟"

"وہ میری استاد ہیں۔"

"کمپیوٹر سائنس پڑھاتی ہیں ___؟"

"جی نہیں۔"

"تو پھر ___؟"

"انہوں نے مجھے سکول میں پڑھایا تھا۔"

"تو اب کیوں فون کر رہی تھیں؟"

"بس یونہی۔ کبھی کبھی وہ فون کر لیتی ہیں۔"

"اور ___ تم ان کے گھر بھی جاتے ہو؟"

"جی۔ کبھی کبھار۔"

"کیوں؟"

"مجھے ان سے عقیدت ہے۔"

"عقیدت ___" ابو کی آواز میں زہریلا طنز تھا۔"یا ___ کچھ اور۔ مجھے تو کچھ ناجائز ___"

علی کے اندر فعال آتش فشاں پھٹ پڑا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے کمرہ تیزی سے گھوم رہا ہو اور کمرے کی تمام چیزیں الٹ پلٹ ہو گئی ہوں۔

"بس، ابو! بس۔ اس سے آگے ایک لفظ بھی نہ کہیں۔"

"کیوں ___؟" ابو جوابی حملے کے لیے تلے بیٹھے تھے۔

"کیوں کہ مس ڈینیل ایک باعزت اور قابلِ احترام خاتون ہیں۔ میں ان کی بڑی عزت کرتا ہوں اور ان کی شان میں گستاخی برداشت نہیں کر سکتا۔"

علی جیسے نرم خُو، دھیمے مزاج کے شرمیلے شخص میں جانے کہاں سے یہ ہمت آ گئی کہ اس نے ابو جیسے جابر کے سامنے سر اٹھایا اور کلمۂ حق کہہ دیا۔ عام طور پر ایسی دباؤ والی صورتِ حال میں وہ لکنت زدہ ہو جایا کرتا تھا۔ اسے خود حیرت ہوئی۔ آج سے چند ماہ پیشتر وہ اس قسم کی جرأت کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا۔

علی نے اپنے اندر کھولتے ہوئے لاوے پر قابو پانے کی ___ بند باندھنے کی کوشش کی، مگر اس کا جسم خود اپنے ہی قہر سے لرز رہا تھا۔ کھولتے ہوئے لاوے کے بے قابو ہونے سے پہلے ہی علی ڈرائنگ روم سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔

"نصیرہ! تم نے اپنے بیٹوں کی کیسی تربیت کی ہے ___ سرکش بھی ہیں ___ بدتمیز بھی ___ اور نااہل بھی۔"

علی کو اپنے کمرے میں بیٹھے ہوئے ابو کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ اسے اندازہ تھا بن دیکھے ہی کہ ابو کی ملامت کے جواب میں امی سر جھکائے یوں بیٹھی ہوں گی ___ ندامت سے نڈھال ___ جیسے وہی ہر چیز کی ذمہ دار ہوں ___ جیسے صرف وہی قصوروار ہوں ___ جیسے انہوں نے پہلے شوہر کے ہوتے ہوئے دوسری شادی رچائی ہو اور

اپنے بچوں کو کسمپرسی کے عالم میں چھوڑ دیا ہو۔

"امی ایک روایتی عورت ہیں جسے ہمیشہ اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا ملتی ہے۔"

علی نے سوچا۔

وہ منہ سر چادر سے لپیٹ کر حسین بھائی کے پلنگ پر لیٹ گیا۔ وہ دنیا سے اپنا رابطہ منقطع کرنا چاہتا تھا تاکہ بل کھاتے ہوئے لاوے کو اپنے اندر ہی سمیٹ لے، ورنہ ہو سکتا ہے کہ وہ تند خو شعلہ بار سب کچھ اپنی لپیٹ میں لے کر خاکستر کر دے۔

ابو نے جو دس روز ان کے ساتھ گذارے وہ امی، علی اور حسین بھائی کے لیے قیامت سے کم نہ تھے۔ ابو صبح سویرے گھر سے نکلتے تھے، دن بھر جانے کیا کرتے پھرتے تھے اور کس کس سے ملتے رہتے تھے۔ رات کو واپس آتے تو نہا دھو کر، کھا پی کر، تازہ دم ہونے کے بعد وہ امی، علی اور حسین بھائی کو اپنے تیروں سے چھلنی کرتے رہتے۔ علی کو یقین ہو چلا تھا کہ انہیں امی سے نفرت تھی ___ شدید نفرت ___ علی اور حسین بھائی کے وجود اسی تنفر کی زد میں تھے۔ کیوں کہ ان دونوں نے امی کے بطن سے جنم لیا تھا، جیسے سیاہی کا قطرہ کاغذ پر گرنے کے بعد پھیل جاتا ہے اور کاغذ کا وہ حصہ بھی اس کی لپیٹ میں آ جاتا ہے، جس پر سیاہی نہیں گری تھی، لیکن علی یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ آخر ابو کو پندرہ سال بعد واپس آ کر ان کے زخم کھرچنے کی کیا ضرورت تھی ___ وہ زخم جن پر وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ کھرنڈ آ چکا تھا۔

ابو کو امی سے جو نفرت تھی، وہ اپنی جگہ حیران کن تھی کہ ان دونوں کی محبت کی شادی تھی۔ محبت ___ اور شادی، شاید دو متضاد چیزیں ہیں۔ شاید محبت بذاتِ خود بھی فریبِ نظر ہے ___ التباس ___ محض واہمہ ___ فطرت کا جال، جس میں لمحوں کے سنگھاسن پر جذبوں کا رنگین چھتر چھا جاتا ہے ___ رس کی بوندیں لبوں سے لبوں پر ٹپکتی ہیں ___

آنکھوں میں قوس قزح تیرنے لگتی ہے ___ اور آدمی بے سدھ ___ بے خوف و خطر، خود سپردگی کے نازک مرحلے سے گذر جاتا ہے، مگر جب خود سپردگی کا یہ دلفریب پل فنا کے بہاؤ میں بہہ جاتا ہے، تو فطرت کے اس سوانگ کے دونوں کردار ___ دونوں فریق ایک دوسرے کو التباس اور فریب کی رنگین پوشاک کے بغیر ننگ دھڑنگ دیکھتے ہیں اور اکثر صورتوں میں ایک دوسرے کو برداشت نہیں کر پاتے۔

ابو اور امی کی پہلی ملاقات ایک دور کے عزیز کے ہاں ہوئی تھی۔ امی بس واجبی سی شکل کی عام سی لڑکی تھیں ___ ایسی لڑکی، جو ہجوم میں ہو تو بے چہرہ ہوتی ہے ___ لوگوں میں بیٹھتی ہے تو بے آواز ___ بولتی ہے تو کسی کو سنائی نہیں دیتی، مگر ___ جب ابو ان سے ملے تو وہ عنفوان شباب کے اس مرحلے میں تھے، جب جذبات کا تازہ پھوٹنے والا چشمہ بے چین ہوتا ہے کہ وہ کسی دریا کے دو کناروں میں سمٹ جائے۔ ابو اپنی زندگی کے اس دور میں تھے، جب برکھا برسے تو کسی دوست کی تمنا بارش کے ہر قطرے کے ساتھ دریچوں کے شیشوں پر بوندوں کی مانند دمکتی ہے ___ جب چاند نکلے تو اس کے روشن تھال میں کسی ان دیکھے محبوب کی شبیہہ چمکتی ہے ___ اور کوئل کی کوک کے ساتھ کسی انجانی آرزو کی کسک ہوک بن کر سینے میں اٹھتی ہے۔ ہر چہرے میں کسی انجانے دوست کی شکل دکھائی دیتی ہے۔

سو ابو ضرورت کے مارے تھے۔ امی موجود تھیں۔ انہوں نے ضرورت کے تحت انہیں فتح کیا اور شاید ___ وہ بھی مفتوح ہونے کو تیار تھیں۔ لیکن جب ضرورت کی تشفی ہو گئی ___ اور رومانوی کسمپرسی کا دور گذر گیا، تو ابو کی فتح سے ___ ان کی کامرانی کے بطن سے، شادمانی کے بجائے بوریت نے جنم لیا۔ جذبے کا وقتی رنگین ملمع اترنے کے بعد ابو کو امی کی تمام خامیاں ___ ساری کوتاہیاں دکھائی دینے لگ گئیں ___ بلکہ ان کی آنکھوں میں چبھنے لگیں۔

امی بھی جلدی پسپائی اختیار کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ انہوں نے ابو کے ذہن میں

بسی خیالی عورت بننے کی سر توڑ کوشش کی۔ ابو نے کہا کہ خواتین کو تعلیم یافتہ ہونا چاہیے۔ میٹرک پاس امی نے کتابیں منگوائیں، تیاری کی۔ پہلے ایف۔اے اور پھر بی۔اے کا امتحان دے کر کامیاب ہوئیں۔ ابو نے کہا کہ بیوی کو شوہر پر ہر بات اور ہر کام میں انحصار نہیں کرنا چاہیے۔ امی خود انحصار ہو گئیں۔ ہر کام چاہے وہ دفتری ہو یا کسی اور نوعیت کا، خود کرنے لگیں۔ ابو نے کہا عورت کو فیشن ایبل ہونا چاہیے۔ امی نے بیوٹی کلینک کی طرف رجوع کیا اور وہ تمام حربے، نسخے اور ترکیبیں ازبر کر لیں، جن پر عمل کرنے سے عورت دلکش اور جاذبِ نظر ہو جاتی ہے۔

اتنا سب کچھ کرنے کے باوجود ابو کی بوریت میں اضافہ ہوتا گیا ___ اور وہ اس خیالی عورت کے تصور میں ___ جو ان کے خیالوں نے تراشی تھی ___ دور ___ بہت دور ہوتے گئے۔ پھر مکانی طور پر بھی بہت دور چلے گئے۔ جب امی کو ابو کی دوسری شادی کی خبر ملی تو انہیں اچنبھا نہ ہوا۔ ان کے لیے تو وہ کب سے کسی اور کی فریفتگی میں مبتلا تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ خیالی عورت تھی ___ اور سلمہ حقیقی عورت تھی۔ البتہ کبھی کبھار امی کے ذہن میں یہ تجسس ابھرتا کہ شاید سلمہ ان کی خیالی عورت سے مشابہت رکھتی ہوگی۔ اسی لیے تو ابو نے اس سے شادی رچا لی، لیکن علی کو شک تھا کہ کہیں سلمہ بھی امی ہی کی طرح ایک عام سی عورت تو نہیں ___ کہیں ایک بار پھر ابو لمبے کی پھسلن کا شکار تو نہیں ہو گئے۔

بعض دفعہ جب علی اور امی کی شادی کے بارے میں سوچتا تو سوچتے سوچتے اسے یہ گمان گذرتا کہ شاید ساری شادیاں ہی ناکام ہوتی ہیں۔ وہ اپنے اردگرد نگاہ دوڑاتا تو اسے لگتا کہ وہ جوڑے جو علیحدہ نہیں ہوئے ___ وہ بھی ایک مردہ تعلق کا جنازہ اٹھائے قبرستان کی طرف جا رہے ہیں ___ ایک دوسرے کے ساتھ قدم سے قدم ملائے چل نہیں رہے، بلکہ اپنے آپ کو گھسیٹ رہے ہیں ___ نہ ان میں رنگینی ہے ___ نہ چاشنی۔

پھر علی کو یہ خیال آتا کہ عورت اور مرد بنیادی طور پر دو مختلف انواع (Species)

ہیں، جن کے درمیان کسی پل جذبے کا کوئی پُل سا بن جاتا ہے، لیکن یہ پُل پل ہی کی طرح بودا ہوتا ہے۔ سنگین حقیقت کے ایک ہی جھٹکے سے پاش پاش ہو جاتا ہے۔ عورت اور مرد بنیادی طور پر ایک دوسرے کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو اس طرح نہیں سمجھ سکتے، جس طرح ایک عورت دوسری عورت کو ___ یا ___ ایک مرد دوسرے مرد کو۔ شاید افلاطون نے ٹھیک کہا تھا کہ مثالی تعلق عورت اور مرد کے درمیان نہیں ___ بلکہ صرف مرد اور مرد کے بیچ ہی ممکن ہے۔

ابو کو آئے دسواں دن تھا۔ صبح کے وقت دروازے میں لگی گھنٹی بجی۔ علی باہر نکلا تو ایک انتہائی لمبا، دبلا، چتلا آدمی جس کی کنپٹیوں کے بال سفید تھے، خاکی رنگ کے تھری پیس سوٹ میں ملبوس، کھڑا تھا۔ اس نے علی کی طرف دیکھا، مگر علی کو یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس کے بجائے دور خلاؤں میں کسی نقطے پر نگاہیں مرکوز کیے ہوئے تھا۔

"تمہارے والد ہیں ___ گھر پر؟"

اس شخص نے علی کے بجائے مکان کے دروازے کو مخاطب کرتے ہوئے سوال کیا۔

"جی ہیں۔"

"ان سے کہو کہ کوئی ان سے ملنے کے لیے آیا ہے۔"

"آپ ___ کا نام؟"

اجنبی نے علی کو یخ کر دینے والی نظروں سے دیکھا۔ علی ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ حسب معمول اس کی زبان کچھ لڑکھڑا سی گئی۔

"میرا ___ مطلب ___ ہے ___ میں ___ کیا ___ کہوں ___ کہ ___ کو ___ کون ___ مل ___ نے آیا ہے؟"

مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "تمہاری امی گھر پہ ہیں؟"

"جی۔"

"ان سے کہو کوئی ان سے ملنے آیا ہے۔"

"کیا نام بتاؤں؟"

علی نے اس مرتبہ پھر اجنبی کا نام معلوم کرنے کی کوشش کی۔

"بس کہو کوئی ان سے ملنا چاہتا ہے___ بڑے ضروری کام کے سلسلے میں۔"

علی کو اجنبی کی پُر اسراریت قائم رکھنے کی کوشش سے الجھن سی محسوس ہوئی۔

بہر حال اس نے اندر جا کر امی کو اجنبی کے بارے میں بتایا۔

"تمہارے ابو کا کوئی جاننے والا ہوگا۔ اسے ڈرائینگ روم میں بٹھاؤ۔" امی نے علی کو ہدایت کی۔

علی نے امی کے کہنے کے مطابق اجنبی کو ڈرائینگ روم میں بٹھا دیا اور خود قریب ہی دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر میں امی بھی ڈرائینگ روم میں آ گئیں۔ اجنبی شائستگی کا اظہار کرتے ہوئے ان کی آمد پر اٹھ کھڑا ہوا۔ امی علی کے پاس بڑے صوفے پر بیٹھ گئیں۔ ان کے بیٹھتے ہی اجنبی بھی بیٹھ گیا۔

"جی___؟" امی نے سوالیہ انداز میں اجنبی کی طرف دیکھا۔

اجنبی نے علی کی جانب اس انداز سے دیکھا جیسے وہ چاہتا ہو کہ علی کمرے سے چلا جائے۔

"آپ علی کی فکر نہ کریں۔ اس کے اور میرے درمیان کوئی راز نہیں اور اگر کوئی بات اس نوعیت کی ہو، جو مخفی رکھنی چاہیے تو اس کا ظرف اتنا ہے کہ یہ اسے محفوظ رکھ سکتا ہے۔"

امی کی اس یقین دہانی کے باوجود اجنبی علی کے سامنے بات کرنے میں تامل

محسوس کرتا تھا، مگر جب اس نے پالیا کہ امی علی کو وہاں بٹھانے پر مصر ہیں، تو اس نے ہتھیار پھینک دیئے۔

"خاتون! کیا آپ مضبوط اعصاب کی مالک ہیں___؟"

امی کے چہرے پر ایک کسیلی مسکراہٹ ابھری۔

"ایک عورت جس نے اپنے شوہر کی بے وفائی کے زہر ہلاہل کو ہنس کر پی لیا ہو، آپ کا کیا خیال ہے وہ مضبوط ہوگی یا نہیں؟"

اجنبی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"تو بس پھر یہ طے ہے کہ میں مضبوط اعصاب کی مالک ہوں۔"

"خاتون! میں آپ کو ایک نہایت ہی اندوہناک خبر دینے والا ہوں۔"

امی اور علی کے وجود تن سے گئے۔

"آپ کے شوہر___؟"

اجنبی رک سا گیا۔

"جی۔"

امی ہمہ تن گوش تھیں۔

"آپ کو معلوم ہے___ وہ اس وقت کہاں ہیں؟"

"جی___ امریکہ میں۔"

کسی نامعلوم خوف سے امی کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

علی متوحش نظروں سے اجنبی کو گھور رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کوئی بم گرنے والا ہے۔

"جی ہاں، مگر وہ اس وقت امریکہ کی ایک جیل میں ہیں۔"

امی کا رنگ نیلا پڑ گیا۔ سانپ نے انہیں ڈس لیا تھا۔ علی کا دل سینے میں اچھلا اور

"میرے شوہر کو مجھ سے یا میرے بچوں سے اس قدر تنفر ہے کہ آپ ہمیں ہلاک بھی کر دیں تو انہیں رتی بھر افسوس نہیں ہوگا۔"

"تو گویا یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے کہ آپ چیک نہیں لیں گی۔"

"اسے میرا فیصلہ نہ سمجھیں ___ حقیقت اور مجبوری کہیں۔"

اجنبی نے امی کے لہجے کی قطعیت کو بھانپ لیا اور مزید اصرار کو بے معنی تصور کرتے ہوئے چیک جیب میں ڈال کر کھڑا ہوا۔

"اچھا، جیسی آپ کی مرضی، مگر ایک بات ذہن نشین کر لیں کہ میری ملاقات اور اس کے دوران کی جانے والی پیشکش کا ذکر، آپ کبھی کسی سے نہیں کریں گی۔ امید ہے آپ میری بات سمجھ گئی ہوں گی، کیوں کہ آپ کافی سمجھدار خاتون معلوم ہوتی ہیں، ورنہ نتائج کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔"

اجنبی نے یہ دھمکی بھی انتہائی ملائمت سے دی۔ پھر وہ تیزی سے چلتا ہوا، ڈرائینگ روم سے نکل کر راہداری سے ہوتا ہوا باہر گلی میں پہنچ گیا۔ علی اضطراری طور پر اس کے تعاقب میں گلی میں پہنچا، لیکن اس کے گلی تک پہنچنے سے پہلے ہی اجنبی غائب ہو چکا تھا۔ علی نے گلیوں میں لاکھ اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی، مگر اسے کہیں اس کا نشان تک نہ ملا۔ نجانے اسے زمین نگل گئی تھی یا آسمان۔

علی کی کائنات الٹ پلٹ گئی تھی۔ زمین پاؤں کے نیچے سے سرک گئی تھی اور آسمان سوا نیزے پر آن اٹکا تھا۔ شہر اجڑا ہوا تھا۔ ہر طرف الاؤ جل رہے تھے۔ ایک خشک گرم ہوا گرد اڑاتی پھر رہی تھی۔ ناآسودہ خواہشوں کا، گہرے سوالوں کا، لاینحل مسائل کا ___ معمہ جذبوں کا ابہام تھا۔ ایک غبار تھا، جس میں سمتیں بے نشان تھیں ___ فاصلے لامکان اور دوریاں لازماں۔ ایک گورکھ دھندا تھا، بہت سے سوالیہ نشانوں کا ___ جن کے

پیچھے نہاں تھا کہ وہ کون ہے، کیا ہے؟___ اور کیوں ہے؟ کیا اس کے اندر ذیشان ماموں کی بے اعتمادی اور وحشت سرسرا رہی تھی، کسی ایسے سانپ کی طرح جو دکھائی نہیں دیتا، لیکن خشک پتوں پر اس کے رینگنے سے جو صدا آتی ہے وہ اس کی موجودگی کا پتہ دیتی ہے۔ کیا ابو کا بے رحم ہرجائی پن اس کی بھی شخصیت کا وصف تھا؟___ کیا اسے حفصہ سے محبت تھی___ یا محض عنفوانِ شباب کا ایک فریب نظر تھا؟___ کیا بابر سچ مچ اس کا گرویدہ تھا؟___ کیا وہ عثمان سے اس لیے ناقابلِ برداشت حد تک خائف تھا کہ وہ اس کے لیے شدید جسمانی کشش محسوس کرتا تھا؟___ وہ نرگس سے گریزاں کیوں تھا؟___ مس ڈینیل اسے کیسے پُرسکون کر دیتی تھیں؟___ وہ امی سے واقعی محبت کرتا تھا یا صرف ان سے محبت کروانا چاہتا تھا؟___ جمی کے لیے اس کے احساسات کیا ہیں؟___ ابو کی گرفتاری کے بعد جو بھونچال آیا ہے، کیا اس میں تار تار ہونے والا عزتِ نفس کا لبادہ اب بھی رفو کیا جا سکتا ہے؟

علی دن رات انہی سوالوں کی آتشیں دوزخ میں جلتا رہتا، مگر الجھی ہوئی ڈور کا کوئی سرا ہاتھ نہ آتا۔ ایک دن وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ یہ بے یقینی کی کیفیت ناقابلِ برداشت ہے___ اسے کچھ کرنا چاہیے___ کسی عمل میں مصروف ہو جانا چاہیے کہ عمل کی مصروفیت میں ہی ڈوب کر اب وہ ابھر سکتا تھا۔

شام کا وقت تھا، علی اٹھا اور اس نے مس ڈینیل کا نمبر گھمایا۔ مس ڈینیل نے خود فون موصول کیا۔

"ہیلو۔"

"ہیلو۔"

"میں مس ڈینیل بول رہی ہوں۔ آپ کون؟"

"جی، میں علی بول رہا ہوں۔"

"اچھا۔"

"میں آپ کی طرف آ رہا ہوں ___ ابھی۔"

علی نے مس ڈینیل کا جواب سننے سے پہلے ہی فون بند کر دیا۔ اسے خطرہ تھا کہ وہ کہیں یہ نہ کہہ دیں کہ پھر کسی وقت آنا۔

مس ڈینیل نے حسبِ معمول گرم جوشی سے علی کا سواگت کیا۔

"کہو، کیسے آنا ہوا؟ تم تو فون پر اس طرح بولے، جیسے کوئی ہنگامی حالت ہے ___ اور مجھ سے ملنا اشد ضروری ہے۔"

مس ڈینیل نے ماحول کو خوشگوار بنانے کی کوشش میں ہلکے پھلکے انداز میں بات کی۔

"بس، ہنگامی حالت ہی سمجھیں۔"

"اچھا، وہ کیسے؟"

علی جواب میں کچھ دیر مس ڈینیل کو تکتا رہا۔ وہ ان کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔ ان کی بھوری آنکھ کی پتلی سے ان کی روح تک اتر جانا چاہتا تھا۔

"آپ آتشدان پر لگے پکاسو کے اندھے گٹارسٹ کو دیکھ رہی ہیں؟"

"ہاں۔" مس ڈینیل نے اضطراری طور پر پلٹ کر اندھے گٹارسٹ کی تصویر کو دیکھا۔

"یہ میں ہوں۔"

علی نے ناقابلِ بیان اداسی سے مس ڈینیل کی طرف دیکھا۔

"آج میرے وجود کے ہر زاویے سے بھی کرب پھوٹ رہا ہے ___ اندھے گٹارسٹ کی طرح۔ اس کے گرد پھیلے نیلے رنگ کی طرح میرے گرد بھی نیلاہٹ ہے ___ نیلے زہر کی۔"

"اس قنوطیت کا کیا سبب ہے؟"

مس ڈینیل کے چہرے پر تفکر کے آثار ابھر رہے تھے۔

ایک سرد آہ کے ساتھ علی نے اپنی نگاہیں مس ڈینیل سے ہٹا کر کھڑکی کے باہر کسی ان دیکھی چیز پر مرکوز کرلیں۔

"میں نے پاتال کو چھولیا ہے۔" علی نے کہا۔

مس ڈینیل خاموش اور منتظر رہیں۔ علی کی نگاہیں کھڑکی کے باہر کسی ان دیکھی چیز سے پلٹ کر دوبارہ مس ڈینیل پر مرکوز ہوگئیں۔

"آج ___ آج میں آپ کے پاس سکون حاصل کرنے کے لیے آیا ہوں۔"

"اچھا، لیکن میرے پاس ہی کیوں؟"

"اس لیے کہ آپ کو دیکھ کر اس پہاڑی چشمے کا احساس ہوتا ہے، جو بلند و بالا پہاڑوں کے سنگلاخ سینے سے پھوٹتا ہے اور بے رحم پتھریلے پیچ وخم سے گذر کر میدانوں میں پُرسکون بہتا ہوا سمندر سے جا ملتا ہے۔"

"دیکھو، علی! چیزوں کا ظاہر دھوکہ بھی دے سکتا ہے۔ شاید میں بھی اتنی پُرسکون نہیں جتنی تمہیں دکھائی دیتی ہوں۔ شاید کوئی بھی اتنا پُرسکون نہیں ہوتا۔ مکمل سکون صرف ایک مثالی کیفیت کا نام ہے، جس کا تصور تو کیا جا سکتا ہے، مگر اسے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

آخری تجزیے میں ہمیں بے سکونی کے ساتھ ہی زندہ رہنا ہوتا ہے۔"

علی صوفے سے اٹھا اور مس ڈینیل کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

"آپ کے ظاہر اور باطن دونوں خوبصورت ہیں ___ آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟"

مس ڈینیل کی آنکھیں خوابناک ہوگئیں، اور وہ جیسے موجودہ سے بے خبری ہوگئیں۔

"بعض لوگ پا لیتے ہیں کہ وہ اکثریت سے مختلف ہیں۔ اس راز کا بھیدی ہونے کے باوجود کچھ لوگ اکثریت کے سامنے پسپا ہو جاتے ہیں، کیوں کہ اکثریت اپنے سے مختلف افراد کو کبھی نہ تو معاف کرتی ہے اور نہ برداشت کرتی ہے، بلکہ انہیں دبانے کی پوری کوشش کرتی ہے، لیکن بعض افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو ان کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں ___ اور اپنے زندہ رہنے کے حق کو منوا لیتے ہیں ___ اپنے تشخص کو برقرار رکھتے ہیں۔ یہ کشمکش سڑکوں اور گلیوں میں نہیں ہوتی ___ اس میں نعرہ بازی اور مظاہرے نہیں ہوتے۔ یہ کارزارِ حیات ___ یہ پیکار خاموش ہوتی ہے۔ یہ جنگ گھروں کے دالانوں اور کمروں میں لڑی جاتی ہے۔ اسی جدل میں یہ ثابت ہوتا ہے کہ کوئی فرد کس دھات کا بنا ہوا ہے۔"

"میں ___ سمجھا نہیں۔" علی نے اپنا سر ایک پالتو کتے کی طرح لاڈ سے مس ڈینیل کی گود میں رکھتے ہوئے کہا۔

"آسان لفظوں میں یوں ہے کہ میں نے اس لیے شادی نہیں کی کہ میں جانتی تھی میرا مزاج شادی کے لیے موزوں نہیں۔ اس صورت میں شادی کرنا، ایک ایسا قدم اٹھانا تھا، جو ایک غیر ذمہ دارانہ فعل کے سوا کچھ نہیں تھا۔ یہ بہت سے دوسرے افراد کو ایک اذیت ناک صورتِ حال سے دوچار کرنے کے مترادف تھا ___ اور اگر میں شادی کر بھی لیتی ___ اکثریت کا لیبل لگا کر اکثریت میں شامل ہونے کے لیے کہ بہت سے ایسا ہی کرتے ہیں، بھیڑوں کے گلے میں شامل ہونے کے لیے ___ تو ___ یہ خودکشی کرنے کے برابر تھا۔ میرا تشخص تو صرف ___ اسی صورت قائم رہ سکتا تھا کہ میں اکثریت کے سامنے ہتھیار نہ پھینکوں۔"

مس ڈینیل بولتے بولتے رک گئیں۔ شاید زیادہ باتیں کرنے سے ان کا گلا خشک ہو گیا تھا ___ یا پھر شاید وہ تفکر میں ڈوب گئی تھیں۔ وہ علی کی طرف دیکھتے ہوئے بھی اسے نہیں دیکھ رہی تھیں۔

چند ثانیوں کی خاموشی کے بعد مس ڈینیل واپس آ گئیں اور انہوں نے علی کی طرف دیکھتے ہوئے بات جاری رکھی۔

"لیکن یقین مانو، علی! اس راستے سے گزرنا صحرائے آبلہ پا گزرنا ہے ___ دار پر لٹکنا ہے۔ سب اس آزمائش میں سرخرو نہیں ہوتے ___ بہت سے تو تاریک راہوں میں مارے جاتے ہیں۔"

علی افسردہ تھا ___ اور افسردہ ہو گیا۔

"اب بتاؤ کہ تم کیسے پاتال میں اترے؟"

"میں ___ ابھی مجھے بہت کچھ سوچنا ہے ___ فیصلہ کرنا ہے ___ اپنے آپ کو پانا ہے۔"

"اگر تم نے پاتال کو چھولیا ہے تو اب تم اور نیچے نہیں گر سکتے۔ تم یقیناً ابھرو گے اور یہ بازی تمہارے ہاتھ رہے گی۔"

"معلوم نہیں ___" علی نے بے یقینی کی کیفیت میں مس ڈینیل کی طرف دیکھا۔

"علی! ایک بات یاد رکھو۔ جب کسی مسئلہ کا سامنا ہو تو اسے سینگوں سے پکڑو، آنکھیں بند کر کے کبوتر کی طرح گزر جانے کے بجائے۔ نظر انداز کرنے سے سوال ختم نہیں ہوا کرتے۔"

"جی۔" علی نے اٹھتے ہوئے کہا۔

"بس ___؟"

"جی۔"

"اتنی جلدی جاؤ گے؟"

"آج ___ مجبوری ہے۔ میں صرف آپ سے سکون کی چند بوندیں ادھار مانگنے آیا تھا کہ اپنے خشک ذہن کو تر کر سکوں ___ اور راہبری بھی حاصل ہو سکے۔"

"خیر ___ میں راہبر تو کیا ہوں گی، ہمیں فیصلے خود ہی کرنے ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تو بتاؤ کہ اصل بات کیا ہے؟"

"ابھی نہیں ___ کچھ مہلت دیں۔ ابھی مجھے بہت کچھ سوچنا ہے ___ شاید کچھ دنوں میں اس قابل ہو جاؤں کہ آپ کو سب کچھ بتا سکوں۔"

"اچھا ___ تمہاری مرضی۔"

مس ڈینیل بھی صوفے سے اٹھ کھڑی ہوئیں۔

"خدا حافظ۔" علی نے کہا۔

پھر اضطراری طور پر اس نے مس ڈینیل کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیا، جھک کر اسے بوسہ دیا اور مزید کچھ کہے سنے بغیر مس ڈینیل کو ہکا بکا چھوڑ کر ڈرائینگ روم سے باہر نکل گیا۔

۱۴

علی دنوں تک شہر کی سڑکوں کی خاک چھانتا رہا۔ اس نے کمپیوٹر کورس کی کلاسوں میں جانا ترک کر دیا۔ وہ صبح گھر سے مال روڈ کی طرف چلنا شروع کر دیتا۔ مال روڈ پہنچ کر باغ جناح کی طرف چل پڑتا۔ باغ میں اِدھر اُدھر گھومنے، درختوں کے نیچے بچھی بنچوں پر ستانے کے بعد وہ ریس کورس پارک روانہ ہو جاتا اور وہاں سے کہیں اور۔

علی گھر لوٹتا تو انگ انگ میں تھکاوٹ رچی ہوتی اور بوٹی بوٹی میں دکھن، لیکن اگلے دن وہ پھر گھر سے نکل جاتا اور شاہراہوں پر مارا مارا پھرتا۔ وہ چاہتا تھا کہ جسمانی طور پر اتنا تھک جائے کہ اس کی نسوں میں دوڑتی سیاہ سیال سوچوں کو حملہ آور ہونے کا کم سے کم موقعہ ملے۔ سو جب رات گئے وہ تھکا ہارا گھر لوٹتا تو فوراً گہری نیند میں اتر جاتا۔

انہی دنوں علی کے ذہن میں عرب کیڈٹ جمال کا حادثہ کسی ویڈیو ری پلے کی طرح بار بار اپنی تمام تفصیلات کے ساتھ ابھرتا رہا۔ عرب کیڈٹ جمال پی۔ اے۔ ایف اکیڈمی، رسالپور میں تربیتی کورس کے لیے آیا ہوا تھا۔ ایک دن اس کا طیارہ شبینہ مشقی پرواز

کے دوران رن وے پر اترنے کی کوشش میں تباہ ہو گیا تھا۔ اس کی راکھ تابوت میں بند کر کے سلامی دی گئی اور پھر اعزاز کے ساتھ فضائیہ کے طیارے میں اس کے وطن روانہ کر دی گئی۔

یہ تھی کل داستان عرب کیڈٹ ___ جمال کی۔ معمہ یہ تھا کہ علی کی اس سے کوئی خاص جان پہچان، میل ملاقات نہیں تھی۔ بس ادھر اُدھر ___ کہیں چلتے پھرتے، آتے جاتے، سرِ راہ آمنا سامنا ہو جاتا تھا۔ جب جمال طیارے کے حادثے میں مارا گیا، تو علی کو یقیناً صدمہ ہوا ___ اس جواں مرگ کا، مگر یہ ایک روایتی سا صدمہ تھا، جو اس کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا ___ اس کے اندر رچا بسا نہیں۔ ویسے بھی انہیں اکیڈمی میں یہ تربیت دی جاتی تھی کہ تم نے موت کو زندگی کا روزمرہ سمجھنا ہے۔ ہر پرواز اپنی جگہ ایک معرکہ ہے۔ زندہ رہے تو سرخرو ___ اور مر گئے تو شہید کہلاؤ گے۔ دونوں صورتوں میں ابدیت تمہارا مقدر ہے ___ تو پھر گھبرانا کیا۔ ڈر ___ خوف ___ دہشت ___ سب بزدلوں کے احساسات ہیں، سوچ کمزوری کی علامت ہے۔

سو علی نے جمال کے لیے وقتی افسوس سے زیادہ کچھ محسوس نہیں کیا تھا۔ اس حادثے نے اس پر زندگی اور موت کے ابدی سوالات کو طاری نہیں کیا۔ جانے اب کیوں بار بار اس کے شعور میں یہ واقعہ تیرتا تھا۔ علی دن کو اس حادثے کی سوچ میں اتنا غلطاں و پیچاں رہتا کہ نیند کی کہر میں بھی وہ منعکس ہونے لگا۔

عرب کیڈٹ جمال کا طیارہ رات کے اندھیرے میں شبینہ مشقی پروازوں کے دوران تباہ ہوا تھا۔ جب اس کے اترنے کی باری تھی تو اس نے دستور کے مطابق یوٹرن لے کر رن وے پر اترنے کی کوشش کی۔ اس لمحے اسے احساس ہوا کہ جہاز میں کوئی گڑبڑ ہے اور اس نے واچ ٹاور میں بیٹھے عملے کو اطلاع دی۔ انہوں نے جواب میں کچھ ہدایات دیں۔ جمال نے ایک بار پھر فضا میں بلند ہو کر اترنے کے لیے یوٹرن لی، جس کے دوران اس کا طیارہ بے قابو ہو کر تیزی سے نیچے گرنے لگا۔ یہ صرف چند ثانیے تھے، جن میں اس کا طیارہ

رن وے کے قریب واقع جنگل میں گرا اور پھٹ کر تباہ ہو گیا۔

جب علی تھکن سے نڈھال، اپنی چیتا جیسی سوچوں سے خائف اور اپنے کنار سوالات سے چھلنی خوابوں میں اترتا تو اس کا شعور معطل ہو جاتا، لیکن ذہن کے پاتال سے جمال کی شبیہہ ابھرتی۔ کبھی اس شبیہہ کا صرف دھڑ ہوتا___ اور کبھی اس دھڑ پر علی کا سر جڑا ہوتا۔ جمال، علی بن جاتا___ یا پھر علی، جمال کا روپ اختیار کر لیتا۔

علی محسوس کرتا کہ طیارہ تیزی سے زمین کی طرف گر رہا ہے۔ وہ بیک وقت طیارے اور واچ ٹاور میں ہے، جہاں انسانوں کے بجائے ہڈیوں کے پنجر ڈیوٹی پر متعین ہیں۔ جب یہ پنجر حرکت کرتے تو ان کی ہڈیاں کھڑکھڑاتیں۔ جب طیارے سے انجن کی خرابی کی اطلاع آتی تو یہ پنجر شیطانی قہقہے کے ساتھ ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے۔

ایک رات علی نے دیکھا کہ طیارہ شہاب ثاقب کی طرح زمین کی طرف چھوٹا جا رہا ہے۔ طیارے کے گرد تیرتی پھڑ پھڑاتی ہوا خاموش ہو گئی ہے۔ جمال، علی ہے اور اس کے سینے میں دل یوں ساکت ہے، جیسے تابوت میں لاش۔ وہ ایوی ایشن سوٹ میں ملبوس ہیلمٹ پہنے، شفاف کینوپی سے آسمان کی نیلگوں وسعتوں میں بکھرے ستارے دیکھ رہا ہے___ حالانکہ سامنے اس کا مقدر___ زندگی کا ناگزیر انجام___ فنا ہے۔

جوں جوں وقت کا دھارا بہتا رہا اور علی کی سوچیں گھمبیر ہوتی گئیں، اس کا یہ خواب کابوس بنتا گیا۔ عجیب سے عجیب تر، وحشت ناک سے زیادہ وحشت ناک اور غیر مربوط سے غیر مربوط تر ہوتا چلا گیا۔ وہ دیکھتا کہ جمال کا طیارہ فضا میں کسی زخمی پرندے کی طرح منڈلا رہا ہے___ اور پھر اپنا توازن قائم نہ رکھتے ہوئے آواز کی رفتار سے زیادہ تیزی سے زمین کی طرف گر رہا ہے۔ علی واچ ٹاور میں فتنہ پرداز پنجروں___ ہڈیوں کے ڈھانچوں کے عقب میں کھڑا ہے۔ ڈھانچے طیارے کو نیچے گرتا دیکھ کر خوشی سے تالیاں بجا رہے ہیں اور کسی نہ سمجھ آنے والی زبان میں اپنی دلی مسرت کا اظہار کر رہے ہیں۔ یکدم علی

کے پَر اُگ آتے ہیں۔ وہ سپر مین کی طرح واچ ٹاور کے گرد لگے شیشوں کو چیر کر ثابت و سالم باہر نکلتا ہے اور گرتے ہوئے طیارے کو کندھے کے سہارے اٹھا لیتا ہے۔ واچ ٹاور کے فتنے اس پر لیزر ریز پھینک رہے ہیں۔ لیکن وہ ان کے اثر سے تباہ ہونے کے بجائے طیارے کے اندر بیٹھے جمال کی جون اختیار کر لیتا ہے۔ وہ طیارے کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتا ہے ___ لیکن وہ جانتا ہے کہ وہ ایسا کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا کہ طیارہ کا توازن اس کے عقب میں بندھے تابوت سے غیر متوازن ہے۔

کچھ دنوں بعد علی کے خواب میں طیارہ غائب ہو گیا اور اس کی جگہ وہ دیکھتا ہے کہ تابوت فضا میں دوڑتے ہوئے سرعت سے نیچے گر رہا ہے۔ علی سپر مین کے نیلے اور سرخ چست لباس میں ملبوس اسے کندھا دینے کے عمل میں ہے۔ واچ ٹاور میں سرخ روشنیوں کی شعاعوں میں ڈوبے ہوئے ہڈیوں کے پنجر رقص کر رہے ہیں۔

علی پر دنوں تک ___ یا یوں کہنا چاہیے کہ قرنوں تک جاں کنی کی کیفیت طاری رہی۔ اس کا سر سوالوں، جذبوں اور سوچوں کی آلودگی سے پھوڑے کی طرح پک گیا تھا ___ اور اب اس سے پیپ رسنے لگی تھی۔ لیکن ایک دن اچانک باغِ جناح سے نکل کر گورنر ہاؤس کی طرف آتے ہوئے اسے لگا کہ اس کے سر میں جو پھوڑا پیر پھیلائے بیٹھا تھا، اس سے پیپ رسنا بند ہو چکی ہے۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ اس کے کندھوں پر جو یہ پیر تسمہ پا سوار تھا، اتر گیا ہے۔ سیاہی کے دائروں کے درمیان مسلسل چکر لگاتے لگاتے وہ بالآخر روشنی کے اس نقطے تک پہنچ گیا تھا، جہاں سے سیاہی کے دائروں کا حصار ٹوٹتا تھا۔

اس رات علی کے خواب میں یہ منظر کھلا کہ خلاء میں ڈولتے تھرکتے تابوت کو وہ بحفاظت رن وے پر اتار لیتا ہے۔ علی تابوت کھولتا ہے ___ تابوت کے اندر بھی علی ہے، جو خواب دیکھ رہا ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں کھل جاتی ہیں اور اس کا کفن [illegible]

طرح اکڑا ہوا جسم اٹھتا ہے اور علی سے لپٹ جاتا ہے ___ علی میں سما جاتا ہے۔ علی نہال ہو جاتا ہے۔ اس کے تن بدن سے گلاب کھلتے ہیں ___ سرخ ___ لہو کی طرح۔

اگلے دن علی نے شیو بنائی اور غسل کیا تو اسے محسوس ہوا، جیسے وہ صدیوں بعد نہایا ہو۔ اس نے استری شدہ پینٹ اور قمیص نکال کر پہن لی۔ بہت دنوں بعد وہ اہتمام سے تیار ہو رہا تھا۔ اس تیاری کے بعد اس نے مس ڈینیل کے گھر کا رخ کیا۔

علی مس ڈینیل کے ہاں پہنچا تو وہ ربڑ کے دستانے پہنے، باغیچے میں باغبانی میں مصروف تھیں۔ وہ کچھ دیر انہیں خاموشی سے دیکھتا رہا۔

"مس ڈینیل! میں سیاہی کے ان دائروں سے نکل آیا ہوں، جن میں بھٹک رہا تھا۔"

علی نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بڑی خوش آئند بات ہے۔"

مس ڈینیل ایک پودے کی فالتو شاخوں کو کاٹتے ہوئے بولیں۔

"معلوم نہیں، یہ خوش آئند ہے کہ نہیں، مگر کم از کم بے یقینی کی سولی پر لٹکنے سے تو بہتر ہے۔"

"تو تم کسی نتیجے پر پہنچ چکے ہو؟"

"جی، کچھ باتیں تھیں جو ناقابلِ فہم تھیں ___ اور کچھ ایسے حقائق بھی تھے، جنہیں میں قبول کرنے سے گریزاں تھا ___ کچھ رشتے تھے جنہیں میں تسلیم کرنے سے خائف تھا۔ بس اک غبار سا تھا میرے ارد گرد، جس میں سمتیں بے نشاں تھیں۔"

"ہاں۔ قبولیت کا عمل مشکل ہوتا ہے ___ مگر قبولیت ہمیں توانا اور قوی کر دیتی ہے۔"

"جی، قبولیت خود سپردگی ہوتی ہے۔"

مس ڈینیل جو ایک کیاری کے پاس بیٹھی تھیں، اٹھ کھڑی ہوئیں اور ہاتھ سے دستانے اتارنے لگیں۔

"آج میں آپ کو یہ بتانے آیا ہوں کہ میں ایک سمگلر کا بیٹا ہوں۔ یہ بات مجھے خود کچھ عرصہ پہلے معلوم ہوئی ہے۔ لیکن میں اسے قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ اسی لیے میں نے پہلے آپ کو یہ راز نہیں بتایا۔ میں خود اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہ تھا۔ میرے اندر مدافعت تھی، جس نے ایک ہیبت ناک کشمکش کو جنم دیا۔

مس ڈینیل کو جھٹکا سا لگا۔

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟"

"جو بھی کہہ رہا ہوں، سچ کہہ رہا ہوں۔"

"کیا فلمی قسم کی باتیں کر رہے ہو؟ تمہارے ___ ابو ___ اور سمگلر!"

"بعض دفعہ حقیقت فلم اور بعض دفعہ فلم حقیقت ہوتی ہے۔" علی نے تلخ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ "یہ ایک تلخ اور ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ میرا باپ سمگلر ہے ___ اور وہ آج کل پاکستان سے ہیروئن سمگل کرنے کی پاداش میں امریکہ کی ایک جیل میں گل سڑ رہا ہے۔"

مس ڈینیل سکتے میں آ گئیں۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں۔ ان کے لب سل گئے۔ شاید اب ان کے پاس کہنے کو کچھ نہیں تھا۔

یکدم خاموشی سیاہ بادلوں کی طرح باغیچے میں اتر آئی۔ علی اور مس ڈینیل کے گرد گھبرا سناٹا چھا گیا۔ علی کے عقب میں دیوار پر منڈھی عشق پیچاں کی بیل میں کوئی چڑیا پھدک رہی تھی۔ کچنار کے درخت پر کوئی پرندہ راگ الاپنے لگا۔ گچھیں کے سفید خوشبودار پھولوں کے گچھوں کی مہک علی کے نتھنوں میں تھی۔

علی فوجی انداز میں اپنی ایڑی پر گھوما ___ اور پھاٹک سے باہر نکل گیا۔ مس ڈینیل اپنی جگہ پر ساکت و جامد کھڑی رہیں۔ انہیں معلوم تھا کہ اب وہ یہاں ___ ان کے پاس کبھی نہیں آئے گا۔

علی پھاٹک سے نکلتے ہوئے پیچھے مڑ کر مس ڈینیل کو دیکھنا چاہتا تھا ___ ایک نظر، لیکن وہ کہانیوں کے شہزادے کی طرح جانتا تھا کہ اگر اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ پتھر کا بن جائے گا۔ سو اس نے سامنے ہی دیکھا اور چستی سے چلتا ہوا سڑک کے ٹریفک کا حصہ بن گیا۔

علی گلی میں داخل ہوا اور نپے تلے قدموں سے ذرا لہرا کر چلتے ہوئے اس عمارت کی بالائی منزل کو جانے والی سیڑھیوں کے سامنے جا کھڑا ہوا، جس میں جمی نے کمرہ لے رکھا تھا۔ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچا تو جمی کے کمرے کا دروازہ بند تھا، لیکن ذرا تھپتھپانے سے کھل گیا۔ اس نے کمرے میں داخل ہو کر دیکھا تو جمی پلنگ پر خواب غفلت کے مزے لے رہا تھا۔

علی نے بڑی احتیاط سے کمرے کا دروازہ بند کرنے کے بعد کنڈی چڑھا دی۔

پھر وہ آہستگی سے چلتے ہوئے کمرے کے مرکز میں پہنچ گیا اور اپنے اردگرد طائرانہ نگاہ ڈالی۔ کمرے میں حسب معمول ہر چیز قرینے سے رکھی تھی۔ پڑھنے والی میز پر کتابیں سلیقے سے سجی تھیں۔ میز پر کتابوں کے آگے خالی جگہ پر ایک شفاف بوتل میں (جو غالباً برانڈی کی تھی) گلاب کے دو پھول ناز سے کھڑے تھے۔ ایئر فریشنر سے کمرہ مہک رہا تھا۔

علی کمرے کی کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ باہر شہر سانس لے رہا تھا۔ چند دن پیشتر شہر کی سڑکوں پر دھول اڑ رہی تھی، ردی کاغذ اور استعمال شدہ پولیتھین بیگ رقصاں تھے اور جگہ جگہ الاؤ بھڑک رہے تھے، مگر ___ اب ___ غبار چھٹنے کو تھا، فاصلے گھٹنے کو تھے، اڑتی ہوئی دھول بیٹھتی جا رہی تھی ___ اور غبار کے چھٹتے ہی، فاصلوں کے گھٹتے ہی، اڑتی دھول کے بیٹھتے ہی اسے اپنا آپ نظر آ رہا تھا ___ آئینے کی طرح شفاف۔

"یہ___ میں ہوں۔" علی نے اپنے آپ سے کہا۔

پھر اسے مس ڈینیئل کی آواز سنائی دی۔

"اکثریت کبھی اپنے سے مختلف افراد کو برداشت نہیں کرتی___ لیکن بعض افراد ایسے بھی ہوتے ہیں، جو ان کے سامنے سینہ سپر ہو جاتے ہیں___ اور اپنے زندہ رہنے کے حق کو منوا لیتے ہیں۔"

"ہاں___ یہ میں ہوں۔" علی نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھتے ہوئے سوچا۔

"یہ میں ہوں، جیسا بھی ہوں___ اپاہج___ معذور___ مسخ شدہ___ یا عجیب الخلقت___ مجھے زندہ رہنے کا حق ہے___ اور کسی کو حق نہیں کہ وہ مجھ سے یہ حق چھین لے۔"

وہ دبے پاؤں چلتے ہوئے اس کرسی پر بیٹھ گیا، جو جمی کے پلنگ کے قریب بچھی ہوئی تھی۔ اس نے تسمے کھولے اور بوٹ اتار کر کنارے پر رکھ دیئے۔ پینٹ کے اندر کی ہوئی قمیص کو باہر نکالا___ اور پھر___ وہ نہایت ملائمت سے سوئے ہوئے جمی کے پہلو میں دراز ہو گیا۔

"کون___؟"

جمی نے نیند کی حالت میں پوچھا اور کروٹ لی۔

"علی۔" علی نے سرگوشی کی۔

جمی نے اس سے نہ کوئی سوال کیا___ نہ کوئی پوچھ گچھ___ نہ باز پرس___ نہ کسی تعجب کا اظہار___ بس وہ علی سے بغلگیر ہو گیا___ اور علی اس سے لپٹ گیا۔ جمی کے جسم کے دباؤ سے علی کے لہو میں پھلجڑیاں سی چھوٹنے لگیں___ ایک ناقابل بیان انبساط کا خیمہ اس پر تن گیا۔

اس خواب جیسی پُر کیف کیفیت میں علی نے نجا کو رقص کرتے دیکھا___ لیکن___ اب اس کا رقص جنگجویانہ نہیں تھا___ مستانہ تھا___ اور علی کو دہشت کے بجائے مسرت محسوس ہو رہی تھی۔

☆......☆......☆

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کا لنک ملاحظہ کیجیے:

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

Syed, Atia

Ghubar. - Lahore: Sang e Mil Publications. 2012. - 144p.. -

ISBN 9693525787

Urdu text. Novel-Social. Novel about the middle classes in Pakistan, dealing with homosexuality which is still a taboo subject in Pakistan.

عطیہ سید ۱۹۸۸ء میں منظرِ عام پر ابھرنے والی ایک منفرد فکشن نگار ہیں جنہوں نے بہت جلد اپنے انوکھے موضوعات، خوبصورت اندازِ بیان اور فنی پختگی کی بنا پر دنیائے ادب میں اپنا مقام بنا لیا۔ انہوں نے اب تک "شہر ہول" کے علاوہ افسانوں کے مزید دو مجموعے اور ناول "غبار" پیش کیا۔ شہر ہول کا دوسرا ایڈیشن "خزاں میں کونپل" کے نام سے شائع ہو چکا ہے اور اب "غبار" کا دوسرا ایڈیشن پیشِ خدمت ہے۔

۱۹۹۵ء میں "شہر ہول" کو ہیرالڈ (کراچی) نے Favourite Fiction of the Year قرار دیا۔ نئے اردو افسانوں کے اکثر انتخابات میں ان کے افسانے شامل ہیں اور کئی ایک کے غیر ملکی زبانوں میں تراجم بھی ہو چکے ہیں۔

عطیہ سید کی فکشن نگاری کے بارے میں آراء

احمد ندیم قاسمی عطیہ سید نے فی الواقع بیدی اور کرشن چندر کی روایت کو زندہ رکھا۔ وہ ایک زندہ فکشن نگار کے طور پر سامنے آئی ہیں۔ (اخبارِ جہاں)

انتظار حسین "It is rare these days to find a writer who can write both fiction and philosophy, and write both with a level of accomplishment. Atiya Syed in this sense as a fiction writer connects with an old tradition."
(The Frontier Post, Lahore.)

جیلانی کامران Atiya Syed writes good prose, understands human psychology and has an aptitude to make her fiction interesting.
(The Dawn, Lahore)

...الرحمٰن "Ghobar" is Atiya Syed's novel which once again reflects her command of literary techniques and ability. It is a well-written psychological study, with a singularly impressive skill she peels off the l... of various characters. The subject of the novel is one of those issues wh... still considered a taboo in Pakistan. *(The News, London)*

...کریم 'غبار' کا موضوع اہم، پلاٹ منطقی، مکالمے بے ساختہ، تجزیہ نفسیاتی اور مصنف کی فلسفیانہ سوچ نے اسے ...ہ ناول بنا دیا ہے۔ (مکالمہ دو، انگلستان)

Rs. 300.00

www.sangemeel.com

ISBN-10 969-35-2378-7
ISBN-13 978-969-35-2378-6
9789693523786